

فہرست

"اردو کے چاند تارے" حصہ نظم

انتساب

گلستانِ اُردو کے رنگا رنگ پھولوں کے اس حسین

گلدستہ کو نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ

امامُ الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

(وزیر تعلیم جمہوریہ ہند)

کے نام نامی اسم گرامی سے منسوب کر کے فخر و مسرت محسوس کرتا ہوں

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

امیر حسن نورانی

یکم مئی ۱۹۵۷ء — اُستاد ادبیات اسلامیہ کالج لکھنؤ

حرفِ آغاز

ادبی شعور کے آغاز ہی سے گلستانِ شعر و سخن کی گلگشت ایک محبوب مشغلہ بنا رہا، خوش رنگ و نکہت بار گلوں کی مہک، حسین و نظر نواز شگوفوں کی دلکشی نے کیف و مستی کا عالم پیدا کر دیا۔ دل میں یہ اُمنگ و ولولہ پیدا ہوا کہ جیب و داماں کو ان رنگا رنگ پھولوں سے بھر لوں اور ان کا ایک حسین و جمیل گلدستہ بناؤں، میری اس جد و جہد کا نتیجہ اہلِ ذوق کے سامنے ہے۔

"اردو کے چاند تارے" اُن تمام باکمال شعرا کا مصور تذکرہ ہے جن کی کوششوں سے ہماری زبان پروان چڑھی اور آج دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہونے لگی، حالات کی ترتیب میں ایجاز و اختصار کے با وصف جامعیت کو پیشِ نظر رکھا، نمونۂ کلام کے انتخاب میں جو کاوش کی گئی ہے اس کا اندازہ اہلِ نظر ہی کر سکتے ہیں ہر شاعر کی تصویر بھی شامل ہے

اس مفید مجموعہ کی ترتیب و انتخاب کے سلسلہ میں خواہر زادہ عزیز نجم الحسن صاحب لیکچرار لکھنؤ یونیورسٹی نے میری بہت مدد کی، یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ عزیز موصوف کی اعانت و ترغیب ہی اس مرقع کی تکمیل کا باعث ہوئی، جس کے لیے میں اُن کا ممنون ہوں۔

مجھے احساس ہے کہ گلستانِ اردو کے بہت سے خوش رنگ و معطر پھولوں کو اس گلدستہ کی زینت نہ بنا سکا۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گل چینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس نوعیت کا اتنا جامع مجموعہ پہلی بار پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں

یکم اکتوبر ۱۹۵۵ء

امیر حسن نورانی

امیر خسرو دہلوی

ولادت ۱۲۵۳ء ـــــــ وفات ۱۳۲۴ء

نام ابوالحسن ۔ تخلص خسرو ۔ باپ کا نام امیر سیف الدین محمود شمس، جو ترکوں کے
قبیلہ لاچین سے تھے اور بلخ سے ہندستان آئے تھے۔ خسرو مقام پٹیالی ضلع ایٹہ (صوبہ
اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ نو سال کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ ان کے
نانا عماد الملک سلطان بلبن کے وزیر جنگ تھے انھیں نے خسرو کی تعلیم و تربیت میں
دلچسپی لی۔ شعر و شاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا۔ بیس سال کی عمر میں جملہ علوم و فنون کی تحصیل
سے فارغ ہو گئے۔ شاہی دربار میں رسائی ہو گئی۔ بلبن سے محمد تغلق تک گیارہ فرمانرواؤں کا
زمانہ دیکھا اور سب ہی نے ان کی قدر و منزلت کی۔ جلال الدین خلجی نے ندیم خاص بنایا۔ اور
امیر لاچین کا موروثی فوجی منصب بھی عطا کیا جس کے باعث ان کو امیر کا خطاب بھی ملا۔
امیر خسرو کے علم و فضل کی شہرت سارے ملک میں پھیل گئی، وہ ایک زبردست عالم اور
عظیم المرتبت فاضل اور بے نظیر شاعر تھے۔ فن موسیقی میں مہارت تامہ حاصل کی اور
بے شمار راگ راگنیاں ایجاد کی ہیں۔ اس وقت وہ ہندستانی موسیقی کے امام سمجھے جاتے ہیں
شعر و شاعری میں ان کا ملکہ مسلم ہے۔ ان کے فارسی اشعار لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ متعدد
دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ عربی، فارسی، ترکی کے علاوہ ہندی اور سنسکرت میں ان کو بڑی مہارت
تھی۔ اردو زبان کے بانی امیر خسرو ہی سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے فارسی اشعار
میں پہلے پہل اردو الفاظ استعمال کیے اور ایک ایسی زبان کی داغ بیل ڈالی جو چھوٹی صدی

میں دنیا کی ایک ترقی یافتہ زبان شمار ہوتی ہے۔

امیر خسرو نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ کے علاوہ کہہ مکرنیاں، دو سخنے، پہیلیاں، گیت ان ہی کی ایجاد ہیں۔

امیر خسرو کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ المعروف بہ "محبوب الٰہی" سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ آٹھ سال کی عمر سے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے، خواجہ صاحب نے اس ارادت کیش سے خود بھی از حد محبت کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "اے ترک من از وجود خود برنجم لیکن از تو نرنجم"۔

سنہ ۱۳۱۴ء میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت امیر خسرو محمد تغلق کے ساتھ بنگال گئے ہوئے تھے۔ دل پر اچانک کچھ اثر ہوا اور فوراً دہلی کی طرف روانہ ہو گئے وہاں پہنچ کر مرشد کے انتقال کی خبر ملی، رنج و غم سے بے حال ہو گئے اور اسی وقت مال و دولت راہ خدا میں فقراء و مساکین پر تقسیم کر دی اور ماتمی لباس پہن کر خواجہ صاحب کے مزار پر پہنچے اور چیخ مار کر فرمایا:-

"سبحان اللہ آفتاب در زمین و خسرو بر زمین زندہ"

اسی کے ساتھ بے ہوش ہو گئے جب ہوش آیا تو یہ شعر پڑھا:-

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس

چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس

اور اس کے فوراً بعد روح قفس عنصری سے عالم اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئی۔ اپنے مرشد کے پائینتی دفن کئے گئے، مزار مبارک آج بھی زیارت گاہ عوام و خواص ہے۔ اور ہر سال عرس بھی ہوتا ہے۔

امیر خسرو اپنی گوناگوں خوبیوں اور غیر معمولی علم وفضل کے باعث آج ساری دنیا میں مشہور ہیں، مستشرقین یورپ نے ان پر اچھے تحقیقی مقالات لکھے ہیں۔ ایران وافغانستان میں وہ اپنے فارسی کلام کی وجہ سے غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔ سنسکرت اور ہندی کے علماء بھی ان کی اتنی ہی قدر وعزت کرتے ہیں جتنی فارسی و اُردو والے۔ وہ اردو زبان کے بانی ہیں، باقاعدہ اردو اشعار تو ان کے نہیں ہیں لیکن اردو فارسی کے ملے جلے اشعار جو ابتدائی عہد کا نمونہ سمجھے جاتے ہیں بہت ہیں۔

نمونۂ کلام

امیر خسرو کی مندرجہ ذیل غزل کو اُردو کی پہلی غزل کہا جاتا ہے۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل، دُرائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جان لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو، بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں، چو ذرہ حیراں، ز مہر آں ماہ گشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ رنگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحق روزِ وصالِ دلبر، کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کے دورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من — یہ گنہ ہم سا تو عجب روتہ ہے (روٹھا ہی)

روئے تو رونق شکن آفتاب — سرو بہ پیش قدِ تو بوتہ ہے (یعنی بوٹا ہی)

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا چلا — آیا کُتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

دو سخنے

انار کیوں نہ چکھا — وزیر کیوں نہ رکھا (دانا نہ تھا)

گوشت کیوں نہ کھایا — ڈوم کیوں نہ گایا (گلا نہ تھا)

پہیلیاں

بیسوں کے سر کاٹ لیا — نہ مارا نہ خون کیا (ناخن)

سر کاٹوں تو امن بنے اور پاؤں کاٹوں تو پیالہ

امیر خسرو یوں کہے رنگ ہی اس کا کالا کالا

(جامن)



ولی دکنی

ولادت سنہ ۱۶۶۸ء ———— وفات سنہ ۱۷۲۲ء

نام شمس الدین یا ولی محمد اور بقول بعض ولی اللہ تھا۔ تخلص ولی، اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں تحصیل علوم کے لئے گجرات گئے اور شاہ وجیہ الدین کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور وہیں شاہ نورالدین صدیقی کے ہاتھ پر بیعت کی، سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا، سنہ ۱۷۰۰ء میں اورنگ زیب کے عہد میں دلی کا سفر کیا۔ دوبارہ سنہ ۱۷۲۲ء میں محمد شاہ کے زمانہ میں دہلی پہنچے۔ سورت اور احمد آباد بھی گئے، دہلی کے مشہور درویش اور شاعر شاہ سعد اللہ گلشن سے ملے اور ان کے مشورہ سے اُردو میں اشعار کہنا شروع کیا۔ جملہ اصناف سخن پر ان کو پوری قدرت حاصل تھی، دلی کے ریختہ گو شعراء کے کلام میں فارسی الفاظ کی آمیزش زیادہ تھی، ولی نے بھاشا کے الفاظ زیادہ استعمال کر کے ایک نیا طرز قائم کیا، ان کی غزلوں میں اخلاقی مضامین بھی ہیں تصوف کے نکات بھی، زبان میں سلاست اور روانی ہے۔ نازک و لطیف استعارے اور تشبیہات کے استعمال نے کلام میں دل کشی پیدا کر دی ہے۔ کلام سچے جذبات کا آئینہ دار ہے ولی اُردو شاعری کے باوا آدم کہلاتے ہیں وہی اُردو کے پہلے باقاعدہ صاحب دیوان شاعر تھے

نمونۂ کلام

ولی اس گوہر کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی — میرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینہ میں راز آوے

تیری یہ زلف ہے شام غریباں — جبیں تیری مجھے صبح وطن ہے
کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانہ ساقی — کہ دل بے تاب جی سے صبر سر سے ہوش لیجاوے
یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا — ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا
طاقت نہیں کسی کو جو اک حرف سن سکے — احوال گر کہوں میں دل بے قرار کا
مسند گل منزل شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر — جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر
جسے عشق کا تیر کاری لگے — اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

اے ولی غیر آستانۂ یار
جبہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر



مرزا سودا

ولادت ۱۷۱۳ء ـــــــــــ وفات ۱۷۸۱ء

نام مرزا محمد رفیع تخلص سودا۔ دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد شفیع کابل کے تاجر تھے۔ اور اسی سلسلہ سے دلّی آئے۔ یہیں پر سودا کا بچپن گزرا۔ طبیعت میں تیزی اور ذہانت تھی۔ بہت جلد عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرلی۔ موزوں طبیع بھی تھے۔ اس لئے لڑکپن ہی میں شاعری شروع کردی۔ فارسی آبائی زبان تھی۔ پہلے فارسی ہی میں شعر کہنا شروع کیا۔ لیکن بعد میں خان آرزو کے کہنے سے اُردو میں کہنے لگے اور انھیں کی شاگردی قبول کی۔ بادشاہ ان سے اصلاح لینے لگے۔ سودا میں تنک مزاجی بہت تھی۔ ایک دن شاہ عالم نے بُلاکر پُوچھا کہ میری غزل کہی؟ سودا نے کوئی بہانہ کر دیا کہنے لگے آخر دن میں کتنی غزلیں کہہ لیتے ہو؟ سودا نے جواب دیا کہ یہ تو طبیعت پر منحصر ہے۔ جب موزوں ہوئی کہہ ڈالا۔ بادشاہ نے کہا کہ میں تو پائخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتا ہوں۔ سودا نے جواب دیا کہ حضور اس میں بُو بھی ویسی ہی آتی ہے اور یہ کہہ کر گھر چلے آئے۔ پھر کبھی بادشاہ کے یہاں نہ گئے۔ حالانکہ بادشاہ نے ملک الشعراء کے خطاب کا بھی لالچ دیا۔ جب دلّی کو مرہٹوں نے لوٹ لیا، شعر و ادب کی مجلسیں اُجڑ گئیں۔ نادر شاہ کے حملے نے قتلِ عام برپا کر دیا۔ سودا نے بھی جان و عزت کی حفاظت کی خاطر بوریا بستر لپیٹ فیض آباد کی راہ لی۔ یہاں نواب شجاع الدولہ نے ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور ایک معقول تنخواہ مقرر کر دی، اس سے پہلے انھوں نے راستے میں فرخ آباد میں بھی مہربان خاں کے ہاں

قیام کیا تھا۔ جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو دار السلطنت قرار دیا تو ساتھ ہی میں سوداؔ کو بھی لکھنؤ لے آئے۔ خاصی رقم کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ لکھنؤ میں اہل دربار اور عوام نے ان کی شاعری کی پوری داد دی۔ محفلوں اور مشاعروں میں ان کی قدر کی جاتی اور دنیائے شاعری میں انھوں نے اُستادی کا مرتبہ حاصل کیا۔ آخر عمر تک یہیں رہے۔ تقریباً ستّر برس کی عمر میں سنہ ۱۷۸۲ء میں انتقال کیا۔ لکھنؤ کے مشہور امام باڑہ آغا باقر میں دفن ہوئے۔

سوداؔ کی تصانیف بہت ہیں ایک فارسی دیوان ہے اور ایک کلیات اُردو بہت ضخیم ہے۔ جس میں قصائد، مثنویات، غزلیات، رباعیات، قطعات۔ سلام۔ مراثی ، واسوخت، مسدس، مستزاد اور ترجیع بند وغیرہ تمام اصناف پر طبع آزمائی کی۔ سوداؔ کی زندگی ہمہ گیر تھی، ان کے مزاج میں شوخی و ظرافت کوٹ کوٹ کے بھری تھی، وہ ہمیشہ شگفتہ اور بشاش رہتے تھے۔ ان کی ظرافت میں طنز کی بھی کیفیت پائی جاتی تھی۔ انھوں نے قصیدے کے دامن کو وسیع کیا اور اُردو شاعری کو ہجو گوئی سے مالا مال کیا۔

سوداؔ قصیدے کے بادشاہ ہیں، انھوں نے فارسی قصیدوں کے مقابلے میں بہت لمبے اور مشکل قصیدے کہے ہیں اور بہت زیادہ تعداد میں کہے ہیں، انھوں نے قصیدے کو نئے نئے مضامین بخشے، زمانہ کی کیفیت، بہار کی منظر نگاری اور شکایت زمانہ اکثر ان کے قصیدوں کی تشبیب میں ملتے ہیں، ان کے قلم میں بہت زور تھا، زبان پر پوری قدرت تھی اور تخیل کی بلندی اور طبیعت کی شگفتگی نے کلام کو بھی شگفتہ بنا دیا۔ نئے نئے استعاروں اور طرح طرح کی تشبیہوں سے اُن کا کلام پُر ہے، اسی لئے وہ

قصیدے میں بہت کامیاب ہوئے۔ لیکن غزل کے لئے یہ زیادہ مناسب نہیں۔

ان کا مزاج اور قلم قصیدے کے لئے زیادہ موزوں تھا، غزل کے لئے کم پھر بھی وہ غزل میں پہلی صف میں گنے جاتے ہیں۔ مرزا نے زبان کی صفائی اور اسکو سلیس بنانے میں کافی محنت کی۔

مجموعی حیثیت سے ان کے کلام میں زور ہے، آمد ہے، روانی اور سلاست ہے۔ مضمون آفرینی اور بندش الفاظ میں خاص ملکہ حاصل ہے۔

سودا نے اُردو میں ہجو گوئی کی بنیاد ڈالی۔ یہ ان کی مزاح نگاری ہو۔ ان کی ہجوؤں میں ظرافت اور طنز ہے۔ کبھی کبھی ترش زبانی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اخلاق کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ مسدس کی ابتدا انھیں نے کی ہے۔ مرثیہ میں منظر نگاری، مرقع نگاری اور جذبات آفرینی انھیں کی شروع کی ہوئی چیزیں ہیں جن کو بعد میں انیس نے وسعت دی۔

ان کے کلام میں تصوّف کی چاشنی ہے، متانت اور سنجیدگی ہے، سادگی ترنم اور شگفتگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ رباعیاں، قطعے، مستزاد، ترجیع بند اور دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔

نمونۂ کلام

خانہ پرورد چمن ہیں آخر اے صیاد ہم — اتنی رخصت دے کہ ہولیں گُل سے ٹک آزاد ہم

خندۂ گُل بے نمک فریاد بلبل بے اثر — اس چمن سے کہو جا کر کیا کریں گے یاد ہم

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ
کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی
سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

جب اس چمن میں چھوڑ کے ہم آشیاں چلے
اک ہم صفیر نے بھی نہ پوچھا کہاں چلے

عمامہ کو اُتار کے پڑھیو نماز شیخ
سجدے سے ورنہ سر کو اُٹھایا نہ جائے گا
ظالم میں کہہ رہا کہ تو اس خوں سے درگزر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

خواجہ میر درد

ولادت ۱۷۱۹ء — وفات ۱۷۸۵ء

نام سید خواجہ میر تخلص درد ۔ دہلی میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام محمد ناصر عندلیب
ے ، آبائی خاندان صدیوں سے بزرگی و فقر کے لئے مشہور ہے ۔

درد کے والد عندلیب کے تخلص سے شاعری کرتے تھے ، وہ ایک صوفی بزرگ
ے اس لئے وہی رنگ ان کے کلام میں ملتا ہے ۔ درد بائیس ۲۲ برس کے تھے جب ان کا
قال ہوگیا اور تصوف و شاعری ورثہ میں چھوڑ گئے ۔

درد بالکل سادہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ باپ کے سجادہ نشین تھے اس وجہ سے
ام اور رؤسا میں ان کی بہت عزت و قدر کی جاتی تھی ۔ گزارہ کے لئے شاہی جاگیر ملی
ی جو بہت کافی تھی ۔

ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو ان کے یہاں ایک مشاعرہ بھی ہوتا تھا جس میں چُنے
ئے دلّی کے شعراء اور سامعین شریک ہوتے تھے ۔

نادر شاہ کے حملہ ۔ قتل عام اور مرہٹوں کے دہلی لوٹ لینے کے بعد جو طوائف الملوکی
ر معاشرتی الجھنیں بڑھیں ان سے تنگ آکر بہت سے شعراء دلّی چھوڑ کر چلے گئے ، سودا ،
ر ، مصحفی وغیرہ لکھنؤ چلے آئے لیکن درد کے ثابت قدم کو جنبش نہ ہوئی ، اپنے سجادہ پر
دگی گزار دی ۔ علائق دنیا سے بالکل الگ تھے جس حالت میں رہے اُسی پر قناعت اور
ر و شکر کیا اور اسی حالت میں ۱۷۸۵ء میں انتقال کیا ۔

درد ایک صوفی تھے اور تصوف کی تمام منزلوں سے واقف تھے، ان کی شاعری تصوّف سے پُر ہے کہیں آورد نہیں ہے، سب آپ بیتی ہے۔ ان کے تصوف کی اصطلاحوں میں تنوع اور جدّت ہے جس سے وہ ایک نئی چیز معلوم ہونے لگتی ہے، وہ خود کہتے ہیں ؎

پھولے گی اس زمین میں گلزار معرفت
میں یاں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا

معرفت حقیقی، وحدت الوجود، ہمہ اوست اور معرفت کے مختلف درجوں کی کیفیات کا اظہار ان کی شاعری کے اہم موضوع ہیں۔ ان کی غزلیں بہت سادہ ہوتی ہیں اور ان میں درد اور اثر کے ساتھ ساتھ سلاست اور روانی کوٹ کوٹ کر بھری ہے، شگفتگی اور موسیقیت کی چاشنی سے ان کا کلام بھرا ہوا ہے اور بقول آزاد "خواجہ میر درد کی غزل سات شعر نو شعر کی ہوتی ہو مگر انتخاب ہوتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو غزلیں کہتے تھے گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے تھے۔" امیر مینائی نے لکھا ہے کہ "درد کے شعر پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں ان کے یہاں عارفانہ سوز و گداز ہے"۔ میر حسن نے لکھا ہے کہ "ان کا کلام اگرچہ مختصر ہے مگر حافظ شیرازی کی طرح منتخب ہو۔ خیالات سنجیدہ اور متین تھے، کسی کی ہجو میں زبان آلودہ نہیں ہوئی۔

ان کی تصانیف میں ایک دیوان فارسی اور ایک اُردو میں ہے ان کے علاوہ آہ سرد، نالۂ درد، واردات درد اور درد دل بھی ہیں۔ نثر میں بھی دو رسالے تصنیف کئے تھے۔

نمونۂ کلام

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

جواب رُخ یار تھے آپ ہی ہم
کھُلی آنکھ جب کوئی پروانہ دیکھا

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو   دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ارض و سماں کہاں تری وسعت کو پا سکے   میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

قاصد! نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے   اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

سینۂ دل حسرتوں سے چھا گیا   بس ہجوم یاس، جی گھبرا گیا

چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم   بہار باغ گو یوں ہی رہے لیکن کدھر شبنم

نہ سمجھا درد ہم نے بھیدیاں کی شادی و غم کا   سحر خنداں ہے کیوں روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

مجھے درد سے اپنے تو نالے ہے یہ بتا مجھے تو کہاں نہیں

کوئی اور بھی ہے ترے سوا تو اگر نہیں تو جہاں نہیں

مرے دل کے شیشے کو بے وفا تو نے ٹکڑے ہی ٹکڑے کر دیا

مرے پاس تو وہی ایک تھا یہ دکان شیشہ گراں نہیں

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے

جس لئے آئے تھے ہم سو کر چلے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں

چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں
کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا
دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

دین و دنیا میں تو ہی ظاہر ہے
دونوں عالم کا ایک عالم ہے

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس، جی گھبرا گیا

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

ہوں قافلہ سالار طریق قدما درد
جوں نقش قدم خلق کو میں راہ نما ہوں

میر تقی میرؔ

ولادت ۱۷۲۴ء ـــــــــــــــ وفات ۱۸۱۵ء

نام میر تقی اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کے نام میں اختلاف ہے بعض نے میر عبداللہ اور بعض نے میر متقی لکھا ہے۔ آپ دس ہی برس کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ میر تقی کی طبیعت رنگین واقع ہوئی تھی۔ ہمیشہ ہجر و فراق کے جذبات کی شدت رہی۔ وہ اکبر آباد سے دلّی چلے آئے، یہاں اپنے ماموں سراج الدین خاں آرزو کے یہاں قیام کیا جو فارسی کے اچھے شاعر تھے، اکثر ان کے یہاں شاعرانہ محفلیں گرم رہتیں، میرؔ کی طبیعت فطری طور پر موزوں واقع ہوئی تھی۔ اس پر عشق کی منزلوں سے واقف تھے، اس لئے انھیں بھی شاعری کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ میرؔ تخلص کیا اور غزلیں کہنا شروع کردیں۔ متعدد بار مختلف جگہوں پر ملازمت کی، لیکن کبھی فارغ البالی نہ میسر آئی، دلی کی تباہی کے بعد عوام کی حالت بگڑنے لگی، میر کو بہت تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ پریشان ہو کر دلّی سے چل کھڑے ہوئے، کچھ دنوں فرخ آباد میں قیام کرنے کے بعد جب آصف الدولہ نے زادِ راہ بھیجا تو لکھنؤ چلے آئے اور بادشاہ نے خیر مقدم کیا۔ دو سو روپے ماہانہ مقرر کر دئے۔ شروع میں اہل لکھنؤ ان کی طرزِ معاشرت دیکھ کر اجنبی پن سے پیش آئے، ایک روز کہیں مشاعرہ تھا میرؔ دہلی کی وضع میں پریشانیوں کی وجہ سے بوسیدہ لباس پہنے ہوئے محفل میں داخل ہوئے، ان کی عجیب و غریب صورت دیکھ کے سب حیرت میں آ گئے، طرح طرح کے سوالات کئے گئے، میرؔ بالکل خاموش رہے اور آخر میں اپنی درد بھری کہانی اس طرح بیان کی:۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

میر بہت نازک مزاج واقع ہوئے تھے، یا پریشانیوں کی وجہ سے چڑچڑا پن طبیعت میں آگیا تھا۔

ایک مرتبہ آصف الدولہ سے بگڑ کر چلے آئے اور پھر کبھی دربار میں نہیں گئے۔ آخر عمر بہت تکلیف میں بسر ہوئی۔ بالکل گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ میر کی زندگی مصیبتوں میں گزری، ان میں درد اور یاس کی شدت ہو گئی۔ عشق کی ناکامیابی کا افسوس انھیں پہلے ہی سے تھا، حرماں نصیبی نے ان کی طبیعت کو غمگین بنا دیا تھا۔ یہی رنگ ان کے کلام سے جھلکتا ہے، ان کی غزلوں میں آپ بیتی ہے جس میں درد ہے، تاثیر ہے، سوز و گداز اور روانی ہے۔ وہ خود روتے ہیں اور دوسروں کو رُلاتے ہیں۔ ان کا کلام سادہ اور صنعتوں سے پاک ہو۔ ان کو خود اس کا احساس ہے، کہتے ہیں: ؎

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں اشعار میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

اور ایہام کا ترک کرنا ہی ان کی کامیابی کا راز ہے، اسی وجہ سے ان کے کلام میں آمد ہے کلام سے ایک ولولہ اور جوش ٹپکتا ہے جس سے جذبات کی شدت کا پتہ چلتا ہے، وہ بہت ہی حساس تھے اس لئے کیفیتوں کو بہت جلد جذب کر لیتے تھے۔ غزل گوئی کے لئے ان کی طبیعت اور ان کا انداز دونوں موزوں تھے۔ اسی کے وہ بادشاہ ہیں۔ ان کے بعد کے

شعراء غالب، ناسخ، ذوق، مومن، حسرت، سبھی نے ان کی اُستادی کا اعتراف کیا ہے
انھوں نے ہر زمین میں طبع آزمائی کی ہے اور چھوٹی بحروں میں تو کمال ہی کر دیا ہے ان میں
ہر جگہ سلاست، روانی، ترنّم اور لوچ ملتا ہے۔

میر نے مثنویوں میں بھی کمال حاصل کیا ہے۔ ان کے کلام کا سرمایہ بہت زیادہ ہے
چھ اُردو دیوان ہیں، ایک دیوان فارسی کا ہے، بہت سی مثنویاں ہیں، اپنی سوانح عمری
خود ہی لکھی ہے، جس کا نام "ذکر میر" ہے۔ "نکات الشعراء" ایک تذکرہ بھی لکھا ہے۔

میر نے کچھ ہجو گوئی بھی کی ہے لیکن ہجو اور قصیدہ ان کے طرز کے نامناسب تھا،
اس لئے اس میدان میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

میر نے زندگی کو درد و غم کے عالم میں دیکھا ہے، اس لئے درد اور تاثیر ان کے
کلام کا خاص جُز ہیں۔ لکھنؤ میں فقر و فاقہ اور گوشہ نشینی کے عالم میں انتقال کیا۔

نمونۂ کلام

اب تو جاتے ہیں بُتکدے سے میر ۔۔۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں ۔۔۔ ایک مدت سے وہ مزاج نہیں

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا ۔۔۔ دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند ۔۔۔ یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

جی ڈھا جائے ہے سحر سے آہ
رات گزرے گی کس خرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اک موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

میر حسنؔ

ولادت ۱۷۳۶ء ——— وفات ۱۷۸۶ء

نام غلام حسن خاں، تخلص حسنؔ۔ آپ میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے تھے دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کی بربادی، لوٹ اور قتلِ عام کے بعد جب میرؔ، سوداؔ، اور مصحفیؔ نے دلّی چھوڑنا شروع کیا تو میر ضاحک بھی دلّی سے فیض آباد چلے آئے، یہاں نواب شجاع الدولہ نے بہت قدر و عزت کی۔ اور جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو پایہ تخت بنایا تو ان کو اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے۔ آپ کا خاندان پہلے سے شاعری میں مشہور تھا، آپ ہی کے پوتے میر انیسؔ نے پانچ پشتوں کی شاعری پر فخر کیا ہے، میر انیسؔ کو ساری خوبیاں ورثہ میں ملی تھیں۔

میر حسنؔ نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن مثنوی میں جو کمال حاصل کیا، وہ کسی اور کے پاس نہ آسکا، سحرالبیان آپ کا شاہکار ہے اور اردو کی بہترین مثنوی خیال کی جاتی ہے۔ شاعری کا فطری ذوق تھا۔ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور وضع کے پابند تھے، شگفتہ مزاج اور خوش اخلاق تھے۔ لکھنؤ میں انتقال کیا تو مصحفیؔ نے "شاعرِ شیریں بیاں" سے تاریخِ وفات نکالی۔

ان کے کلام میں دہلی اسکول کا رنگ نمایاں ہے۔ اشعار میں سادگی ہے، جوش ہے، روانی ہے، اور آمد ہے، جذبات کا ہو بہو اظہار ہے، خارجی پہلوؤں میں بھی داخلی کیفیات پائی جاتی ہیں، منظر نگاری اور مرقع کشی میں تمام ہمعصروں پر سبقت

لے گئے ہیں، ان کی مثنوی کے کردار صرف خیالی اور غیر فطری نہیں بلکہ ان میں وہ تمام انسانی خصائل ملتے ہیں جو انسانی کردار کے جزو ہیں، ان میں انسانی نفسیات کا تجزیہ بھی ہے۔

محاوروں کا خوبی سے استعمال اور موقع و محل کے اعتبار سے الفاظ کی بندش ان کی خصوصیات ہیں۔ ان کی مرقع کشی میں مقامی رنگ ہر جگہ نمایاں ہے۔

ان کی مثنوی "سحر البیان" کو اگر ہم سماجی اور تاریخی کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس سے ہم کو اس زمانے کی طرز معاشرت، جاگیردارانہ نظام، تہذیب و تمدن کے اصول اور کلچر کی خصوصیات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہیں لیکن اسکی اہمیت ادبی نقطۂ نظر سے زیادہ ہے اس کے بیان میں ستھرا پن ہے، مقامی تشبیہیں اور سماج کے خیالات کا اظہار ہے جس کی ترجمانی میر حسن نے کی ہے، یہ آپ بیتی بھی ہے اور خارجی بیان بھی۔

نمونۂ کلام

دیے نظیر کے فراق میں بدر منیر کی بے قراری:-

پلا ساقیا! ساغرِ بے نظیر ۔۔۔ پھنسی دام ہجراں میں بدر منیر
وہ حُسن و جوانی اور اس پر یہ غم ۔۔۔ ستم ہے ستم ہے ستم ہے ستم
جہاں بیٹھنا آہ کرنا اسے ۔۔۔ بہانہ نزاکت پہ دھرنا اسے
کبھی خون آنکھوں سے رو ڈالنا ۔۔۔ کسی کو کبھی دیکھ دھو ڈالنا
خفا زندگانی سے ہونے لگی ۔۔۔ بہانے سے جا جا کے سونے لگی
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا ۔۔۔ نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا

جہاں بیٹھنا پھر نہ اُٹھنا اسے — محبت میں دن رات گھٹنا اسے

(خواصوں کی پریشانی شہزادہ کے غائب ہونے پر :-

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی — کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی

کوئی سر پہ رکھ ہاتھ دلگیر ہو — گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو

کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی — رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی

رہی کوئی انگلی کو دانتوں سے داب — کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب

(داستان حمام میں نہانے کی :-

ہوا جب کہ داخل وہ حمام میں — عرق آگیا اس کے اندام میں

تنِ نازنیں نم ہوا اس کا کُل — کہ جس طرح ڈوبے ہو شبنم میں گُل

نہانے میں یوں تھی بدن کی دمک — برسنے میں بجلی کی جیسے چمک

لبوں پر جو پانی پڑا سر بسر — نظر آئے جیسے وہ گلبرگ تر

ہوا قطرۂ آب یوں چشم بوس — کہے تو پڑے جیسے نرگس پہ اوس

وہ گورا بدن اور بال اسکے تر — کہے تو کہ ساون کی شام و سحر

زمرد کے لے ہاتھ میں سنگ پا — کیا خادموں نے جو آہنگ پا

ہنسا کھلکھلا وہ گُلِ نوبہار — لیا کھینچ پانوں کو بے اختیار

عجب عالم اس نازنیں پر ہوا — اثر گدگدی کا جبیں پر ہوا

ہنسا اس ادا سے کہ سب ہنس پڑے — ہوئے جی سے قربان چھوٹے بڑے

دعائیں لگے دینے بے اختیار
کہا خوش رکھے تجھ کو پروردگار
کہ تیری خوشی سے ہو سب کی خوشی
بلاؤں تجھے روز و شب کی خوشی

سحر البیان

شریف زادوں کی وضع عہد نواب آصف الدولہ

گلے میں پڑا نیمہ شبنم کا ایک
بدن سے عیاں نور عالم کا ایک

تمامی کی سنجاف جلوہ کناں
کہ جوں عکس مہ زیر آب رواں
طرحدار اک سر پہ بیٹھا ہوا
ستارہ ہو جوں صبح کا جگمگا
وہ موتی کی لٹکن زمرد کی لڑ
لٹک جس کی زیبندۂ دستار پر
اک الماس کی ہاتھ میں انگشتری
سراسر حنا دست و پا میں لگی

اکڑ زلف کی اور کاکل کا بل
جوانی کی شب اور سماں برمحل



نظیر اکبر آبادی

ولادت سنہ ۱۷۴۰ء ———— وفات سنہ ۱۸۲۰ء

نام شیخ ولی محمد ۔ نظیر تخلص، دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ والدہ کے ساتھ آگرہ چلے آئے۔ وہ محلہ تاج گنج کی رہنے والی تھیں، وہیں انھوں نے بھی قیام کیا۔ ایک مکتب میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، طبیعت میں موزونیت فطرت سے ملی تھی، اس لئے شاعری شروع کی، وہ ایک سادہ، پرہیزگار اور صوفی منش آدمی تھے، انھیں دنیا کی رنگ رلیوں سے بہت کم تعلق تھا، ایک اوسط درجے کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ساری عمر معلمی میں بسر ہوئی۔ یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا انھوں نے کبھی دولت کی خواہش نہ کی۔ وہ قناعت پسند تھے، اودھ اور بھرت پور کے حکمرانوں نے دعوت نامے بھیجے لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ ابھی تک وہ اردو کے پہلے شاعر تھے۔ جنھوں نے کسی دربار سے تعلق نہیں رکھا۔ اسی لئے ان کو شہرت نہ حاصل ہو سکی اور نہ ان کا کلام دولت مند طبقہ کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہے

سنہ ۱۸۲۰ء میں آگرہ ہی میں انتقال کیا۔ نظیر نے کائنات کا مطالعہ بہت گہری نظر سے کیا، وہ زندگی کے ہر پہلو کو غور سے جانچتے ہیں۔ انھیں روزانہ زندگی میں آنے والے واقعات سے گہری دلچسپی ہے، وہ ایک ایک چیز کو دیکھتے ہیں، سوچتے ہیں، شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ اور پھر ان کو شعر کا جامہ پہناتے ہیں، وہ عوام کے شاعر ہیں، انھوں نے عوام کی زندگی کی مرقع کشی کی ہے، وہ فطری مناظر اور خیالات کو پیش کرتے ہیں، منظر نگاری

میں کمال دکھایا ہے۔ برسات کا سماں ہولی، دیوالی، روٹی، میلوں کے نقشے، چاندنی رات اور زمانہ و سماج کے عام حالات ان کی شاعری کے خاص موضوع رہے ہیں اور لطف یہ کہ ہر مضمون میں ایک جدت اور تنوع ہے ان کا تفصیل سے بیان ہے۔

نظیر نے کبھی کسی کی شاگردی نہ قبول کی۔ شاعری میں وہ آزاد تھے، اسی لئے ان کا کلام ہمعصروں سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے یہاں قصیدے اور مثنویاں نہیں ہیں، ان کا فطری رجحان نظم کی طرف تھا، اسی لئے ان کے یہاں قطعوں، مسدس اور مخمس کی کثرت ہے، غزل میں سادگی، ترنم اور تاثیر کافی ہے ان میں آپ بیتی کی چاشنی ملتی ہے ان کی زبان بہت سادہ اور صاف ہے، ان میں فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت نہیں ہے، اچھے خاصے ہندی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں، ان کی تشبیہیں زیادہ تو ہندستانی ہیں ان کے کلام کا سرمایہ بہت زیادہ ہے، الفاظ بھی بہت کثیر تعداد میں استعمال کئے ہیں،

سادگی ہر جگہ نمایاں ہے اور کہیں کہیں ابتذال کی حد کو بھی پہنچ گئے ہیں یہی انکی خامی ہے، ورنہ ان کا کلام سادگی اور فصاحت میں کسی سے کم نہیں ہے، صرف انیس کو ان کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے، ان کا کلام تصنع اور آورد سے پاک ہے، ان کے یہاں حقیقی محسوس کئے ہوئے جذبات کا اظہار ہے، اس لئے ان میں آمد اور جوش ہے۔

ان کا ضخیم کلیات شائع ہو چکا ہے، ان کی اچھی اور مستند سوانح عمری "تذکرہ بے نظیر" ہے، جسے عبدالغفور شہباز نے مرتب کیا ہے۔

نمونۂ کلام

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقّارا
کیا بدھیا بھینسا، بیل شتر، کیا گوئیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چاول، موٹھ مٹر کیا آگ دُھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جاکے بٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

پھریں ہیں راکھیاں باندھے جو ہر دم حُسن کے مارے
تو ان کی راکھیوں کو دیکھ اے جان چاؤ کے مارے
پہن زنّار اور قشقہ لگا ماتھے اوپر بارے
نظیر آیا ہے باہمن بن کے راکھی باندھنے پیارے
بندھا لو اس سے تم ہنس کر اب اس تہوار کی راکھی

(شاعر جتا کر خاک کا اُڑنا دکھا کر گرد کا چکر " محبوب کو اپنے گھر لیجاتا ہے:-
اس آندھی میں اہا ہا ہا عجب ہم نے مزے مارے
فلک پر عیش و عشرت سے دکھائی دے گئے تارے

رقیبوں کی ہے اب خواری خرابی کیا لکھوں بارے
تلے کوٹھے کے بیٹھے آٹ گئے سب گرد کے مارے
بھری نتھنوں میں ان کے خاک دس دس سیر آندھی میں

"آندھی"

(آٹے دال کا بیان)

کیا کہوں یارو میں نقشہ خلق کے احوال کا
اہل دولت کا چلن یا مفلس و کنگال کا
یہ بیاں تو واقعی ہے ہر کسی کے حال کا
کیا تونگر کیا غنی کیا پیر اور کیا بال کا
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

گر نہ آٹے دال کا ہوتا قدم یا درمیاں
منشی و میر و وزیر و بخشی و نواب و خاں
جا گئے دریا میں کیوں آدھی رات ہاں
کیا عجب نقشہ پڑا ہے آہ کیا کہئے میاں
سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

دیکھ لے اس چمنِ دہر کو دل بھر کے نظیر
پھر ترا کاہے کو اس باغ میں آنا ہوگا

مصحفی

ولادت ۱۷۵۰ء ——— وفات ۱۸۲۴ء

نام غلام ہمدانی، تخلص مصحفی، باپ کا نام شیخ ولی محمد، بمقام امروہہ ضلع مرادآباد پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی، پھر تحصیل علم کے لئے دلّی پہنچے، وہاں علماء و فضلاء کی صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے، شعروشاعری کا ذوق فطری تھا۔ اس میدان میں شہرت ہونے لگی۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ کی داد و دہش کی شہرت عام تھی، دیگر ارباب فضل وکمال کی طرح مصحفی بھی دلّی چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے یہاں انشا کے ذریعہ سے شہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ گر کچھ دنوں بعد انشاء اور مصحفی میں چوٹیں چلنے لگیں، بڑے بڑے ادبی معرکے ہوئے اور ہر طرف مصحفی کی شہرت پھیل گئی۔ ان کی اُستادی کی عظمت کے سب ہی قائل ہیں۔

آتش نے انھیں کی شاگردی اختیار کی، ناسخ بھی انھیں سے اصلاح لیتے تھے۔ مصحفی کے کلام میں سلاست اور روانی ہے، رنگ تغزل میں ندرت ہے۔ اخلاق و تصوف کی چاشنی بھی ہے اور فلسفہ و اخلاق کی شیرینی بھی۔ وہ ہر رنگ میں شعر کہتے تھے، مبتذل اور سوقیانہ اشعار ان کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ مصحفی ایک مصنف کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں، اُردو شاعروں کے دو تذکرے لکھے (۱) "ریاض الفصحاء" (۲) "تذکرہ ہندی"، اسی طرح فارسی شعراء کا ایک تذکرہ "عقد ثریا" لکھا، مصحفی کے آٹھ اُردو دیوان اور جیسی مثنویاں موجود ہیں، دو فارسی دیوان

خود مرتب کئے تھے۔ مصحفی ان باکمال شعراء میں ہیں جن پر اُردو ادب کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ ۱۸۲۴ء میں لکھنؤ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام

یاد ایام بے قراری دل
وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا

بعد مدت کے اِدھر آ نکلے ہو تم شیخ جی
جی میں ہے کچھ آج کیجئے میہمانی آپ کی

لطف تب تک تھا کہ جب کچھ باعث آئے درمیاں
آپ نے مانی ہماری ہم نے مانی آپ کی

یا وہ عالم تھا کہ کوئی اس سے واقف ہی نہ تھا
یا یہ عالم ہے کہ عالم اس پہ مرجانے لگا

کون گلزار سے اے باد صبا جاتا ہے
رنگ رخسار سے پھولوں کے اُڑا جاتا ہے

دل دھڑکنے کا یہ عالم ہے کہ بے منت دست
پرزے ہو ہو کے گریبان اُڑا جاتا ہے

پوچھ کچھ صفحۂ ہستی پہ نہ حال انساں
ہے عجب نقش کہ خود آپ مٹا جاتا ہے

مصحفی عشق کے میداں میں گزر ہے کس کا
بھولا بھٹکا کوئی اس سمت بھی آجاتا ہے

انشاء

ولادت ۱۷۵۶ء ——— وفات ۱۸۱۷ء

نام میر انشاء اللہ خاں۔ تخلص انشاء، باپ کا نام حکیم ماشاء اللہ خاں مصدر، ان کے
و اجداد عراق سے کشمیر آئے، وہاں سے ہندستان آکر آباد ہو گئے تھے۔ حکیم صاحب دلّی
شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے آثار نمایاں ہوئے تو یہ مرشدآباد
ں چلے گئے، انشاء مرشدآباد ہی میں پیدا ہوئے، ابتدا سے بہت ذہین تھے جلد تعلیم سے
غ ہو گئے۔ عربی، فارسی، ترکی، پشتو اور اردو جانتے تھے۔ سنسکرت سے بھی لگاؤ تھا،
موسیقی میں ماہر تھے، شعر و شاعری کا ذوق ہوا تو اس طرف لگ گئے، شاہ عالم کے زمانہ
دہلی پہنچے وہاں افراتفری کا دور تھا یہ لکھنؤ چلے آئے۔ سلیمان شکوہ کے دربار میں رہے
دربار اودھ تک رسائی ہوئی اور خوب عروج حاصل کیا، ۱۸۱۰ء سے گوشہ نشین ہو گئے
س دوران میں جنون کا مرض لاحق ہو گیا، ۱۸۱۷ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

انشاء اردو کے بلند پایہ شاعر تھے بقول مولانا آزاد وہ اردو کے امیر خسرو ہیں،
م میں لطافت اور روانی ہے، زبان پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ ہر صنف سخن میں
آزمائی کی، ریختی کے ماہر تھے، ان کے کلام میں ہزل و تمسخر بہت ہے، کیونکہ وہ فطرتاً
ف تھے، انھوں نے "دریائے لطافت" کے نام سے اردو قواعد کی سب سے پہلی کتاب
ں۔ ایک کتاب "رانی کیتکی کی داستان" بھی تصنیف کی، جس میں عربی و فارسی کا کوئی
نہیں استعمال کیا۔

نمونۂ کلام

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
یہاں رو پیٹ کران سب کو ہم اک بار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے
زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

ہوئے ہیں خاک سرِ راہ اس کی ہم انشاؔ
بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

بہادر شاہ ظفر

ولادت ۱۷۷۵ء   وفات ۱۸۶۳ء

سراج الدین محمد نام بہادر شاہ لقب اور ظفر تخلص تھا۔ خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار تھے ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئے، غدر ۱۸۵۷ء میں انگریزی تسلط قائم ہوا تو بہادر شاہ کو معزول کر کے جلا وطن کر دیا گیا اور رنگون بھیجدیا گیا۔ وہیں ۱۸۶۳ء میں انتقال ہوا اور سرزمین (برما) میں دفن ہوئے۔

ظفر شہسواری اور تیغ زنی کے ساتھ علم و ادب میں بھی بڑی دستگاہ رکھتے تھے اور شعر و شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے تھے پھر ذوق کی شاگردی اختیار کر لی۔

ظفر کے کلام میں کم و بیش وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو اس دور کے بلند پایہ شعراء میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے کلام میں سوز و گداز ہے، درد و اثر ہے اور سادگی و پُرکاری۔ جرأت جیسی معاملہ بندی ہے، اُن کی جیسی سنگلاخ زمینوں میں کم لوگوں نے شعر کہنے کی ہمت کی ہے بے لطف قافیے خشک ردیفوں کے ساتھ بڑی خوبی سے نظم کرتے ہیں واردات عشق و محبت سلیس زبان میں بیان کرتے ہیں، کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے فارسی ترکیبوں سے گریز کرتے ہیں۔ ہندی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں، اُن کے خیالات بلند اور پاکیزہ اور تشبیہیں رنگین اور متنوع ہوتی ہیں۔

کلیات ظفر چار ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکا ہے جن میں تمام اصناف سخن موجود ہیں۔

نمونۂ کلام

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مُشت غبار ہوں

میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا، مرا درد سُن کے کرو گے کیا
میں بڑے ہی روگ کی ہوں صدا کسی دل جلے کی پکار ہوں

میں کہاں رہوں میں کہاں بسوں نہ یہ مجھ سے خوش نہ وہ مجھ سے خوش
میں زمیں کی پیٹھ کا بوجھ ہوں، میں فلک کے دل کا غبار ہوں

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی شمع لا کے جلائے کیوں، کہ میں بے کسی کا مزار ہوں

نہ ظفر کسی کا رقیب ہوں، نہ ظفر کسی کا حبیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اُجڑ گیا وہ دیار ہوں

جوش گریہ سے ترے ہجر میں اے رشک چمن   چشم بد دور یہ آنکھ ابر بہاراں تھی رات

حسرت ہے اُس اسیر قفس پر کہ جس کے پر   اُڑتے پھرے ہیں بعد فنا بھی چمن کے گرد

پی لاکھ بار صہبا، کی لاکھ بار توبہ   ہم کر چکے ہیں توبہ توبہ ہزار توبہ

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا   یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
خاکساری کیلئے گرچہ بنایا تھا مجھے   کاش خاک در جانانہ بنایا ہوتا

ظفر آدمی اُس کو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

آتش

ولادت ۱۷۷۸ء ——————— وفات ۱۸۴۶ء

نام خواجہ حیدر علی، تخلص آتش، ان کے والد دہلی میں رہتے تھے لیکن جب دلّی لٹ گئی تو فیض آباد میں آ کر پناہ لی، یہیں آتش کی پیدائش ہوئی، جب لکھنؤ حکومت کا مرکز ہوا تو لکھنؤ منتقل ہو گئے، اس زمانے میں یہاں انشاء اور مصحفی کا زور تھا، دونوں میں فنی مقابلہ ہو رہا تھا، آتش کے سر سے سایۂ پدری کم عمری ہی میں اُٹھ گیا، اس لئے ان کے مزاج میں آزادروی اور بانکپن پیدا ہو گیا۔ شہر میں شاعری کا چرچا دیکھ کر یہ شوق بھی پیدا ہوا اور شعر کہنے لگے، مصحفی کو اُستاد تسلیم کر کے اصلاح لینا شروع کر دی کچھ دنوں بعد طبیعت کا رنگ بدل گیا اور کافی سنجیدگی، متانت اور سادگی پیدا ہو گئی۔ بہت جلد فن شاعری میں کمال حاصل کر لیا اور اُستاد کی وفات کے بعد ان کی جگہ پر فائز ہوئے، ان کے حریف ناسخ تھے، جن کی شہرت اور قدر عوام سے زیادہ خواص میں تھی، ناسخ دولت مند تھے اور رؤسا کے اُستاد تھے اس کے برعکس آتش صوفی منش اور ایک سادہ انسان تھے، دونوں میں سخت مقابلہ رہتا، آپس میں ایک دوسرے پر لفظی حملے بھی کرتے۔ حاضر جوابیوں کے جوہر دکھاتے، ایک مرتبہ کسی رئیس کے یہاں مشاعرہ تھا جو ناسخ کے معتقد تھے، انھوں نے سر محفل خلعت دینے کا ارادہ کیا، آتش کو صرف ایک روز پہلے اطلاع دی، بہت خفا ہوئے۔ شہر کے باہر ایک مسجد میں چلے گئے اور غزل کہہ کر لے آئے، دوسرے روز مشاعرہ میں گئے تو ایک قرابین بھی بھر کر لیگئے

اور ناسخ کے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ جب شمع آئی تو یہ مطلع پڑھا ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

پوری غزل اسی رنگ میں تھی۔ ہر شعر میں ان پر چوٹ تھی، صاحب محفل بہت ڈرے اور ان کے لئے ایک خلعت تیار کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی دونوں کو خلعت پیش کیا۔ ساری عمر قناعت و توکل میں گزری۔ ۱۸۴۷ء میں اس جہان فانی سے کوچ کیا۔

آتش غزل گو شاعر ہیں۔ لکھنؤ اسکول کا عام رنگ ان کے کلام سے نمایاں ہے آتش صوفی منش بزرگ تھے وہ دنیا کی رنگ رلیوں سے دور، نمائشی چیزوں سے گھبراتے تھے، اسی لئے ان کے کلام میں تصوّف کی چاشنی کافی ہے، دلی جذبات کا اظہار، سوز و گداز اور سادگی ان کے کلام میں لکھنؤ کے تمام شعراء سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں تغزل کا رنگ کافی ہے، اسی لئے ان کا مرتبہ ناسخ اور شعرائے لکھنؤ میں سب سے زیادہ ہے۔

نمونۂ کلام

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

تکلف سے بری ہے حُسن ذاتی
قبائے گُل میں گُل بوٹے کہاں ہیں

یہ کیفیت اسے ملتی ہے ہو جس کے مقدر میں　　مئے اُلفت نہ خم میں ہو نہ شیشہ میں نہ ساغر میں
جہاں چاہے بسر اوقات کر لے چار دن بُلبل　　چمن میں آشیانہ ہو قفس صیاد کے گھر میں

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی۔ اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

بڑا شور سُنتے تھے پہلو میں دل کا　　جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

فریبِ حُسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا　　خدا کی یاد بھولا شیخ بُت سے برہمن بگڑا

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا　　کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

ناسخ

ولادت ۱۷۵۷ء
وفات ۱۸۳۸ء

نام شیخ امام بخش، تخلص ناسخ، لکھنؤ وطن اور پہلوانِ سخن، لقب تھا، بڑی آن بان کے آدمی تھے اور ہمیشہ اپنی آن بان کو قائم رکھا۔ ناسخ اُردو زبان کے معماروں میں شمار کئے جاتے ہیں، انھوں نے زبان کو رطب یابس سے پاک کیا، تذکیر وتانیث کے قاعدے بنائے، زبان کو شگفتہ وشُستہ بنانے کی پوری کوشش کی لیکن انھوں نے عربی فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کئے، بندش فارسی طرز پر قائم کی جس سے زبان میں نقائص بھی پیدا ہوگئے، صنائعِ لفظی کی کثرت اور عربی فارسی کے مشکل الفاظ کی بھرمار نے ان کے کلام کو مغلق بنا دیا، وہ تشبیہات اور استعارات زیادہ استعمال کرتے تھے اور فلسفیانہ مضامین بھی بکثرت نظم کرتے تھے۔

ناسخ نے داخلی پہلو سے زیادہ خارجی پہلو پر توجہ کی پھر بھی اُن کے کلام میں کہیں کہیں تاثیر کے جوہر موجود ہیں

نمونۂ کلام

وہ چشمِ فتاں ہے غیرتِ گل، وہ زلفِ پیچاں ہے رشکِ سنبل
عذار میں ہے شباہتِ گل، بدن میں عالم ہے یاسمیں کا

یہ ساعدوں کا ہے اُس کی عالم، کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بے دم
نیامِ تیغِ قضائے مبرم، لقب ہے قاتل کی آستیں کا

جان پا جاؤں زندگی ہو جائے   موت آجائے گر جدائی میں

تمام عمر یونہی ہو گئی بسر اپنی   شب فراق گئی روز انتظار آیا

پونچھتا اشک اگر گوشۂ داماں ہوتا   چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے   آج آتی شب فرقت میں تو احساں ہوتا

دل اک بت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے   خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے

گزر اس پری کا ہے اکثر چمن میں   درختوں کو سایہ ہوا چاہتا ہے

زندگی زندہ دلی کا ہے نام   مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

باندھتے ہیں اپنے دل میں زلف جاناں کا خیال   اس طرح زنجیر پہناتے ہیں دیوانے کو ہم

اشک تھم جائیں جو فرقت میں تو آہیں نکلیں   خشک ہو جائے جو پانی تو ہوا پیدا ہو

پونچھتا اشک اگر گوشۂ داماں ہوتا   چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا

پنجۂ وحشت سے ہوتا ہے گریباں تار تار   دیکھتے ہیں کاکل جاناں میں جب شانے کو ہم

ذوق دہلوی

ولادت ۱۷۸۹ء
وفات ۱۸۵۴ء

نام محمد ابراہیم ۔ ذوق تخلص ۔ باپ کا نام محمد رمضان جو دلی میں ایک سپاہی تھے ، لیکن ذوق کی فطرت ان سے مختلف تھی ۔ انھوں نے بچپن ہی سے شاعری کرنا شروع کردی ، اپنا کلام شاہ نصیر کو دکھاتے تھے جو اُستاد کا مرتبہ رکھتے تھے ، شاہ نصیر کا ایک خاص رنگ ہے ، اسی کو ذوق نے بھی اختیار کیا ۔ ذوق نے شاعری میں بہت کمال حاصل کیا اور مقبولیت پائی اور یہاں تک چرچا ہوا کہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر اپنا کلام دکھانے لگے ۔ شاہ اکبر ثانی نے خاقانی ہند اور ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا ، بہادر شاہ کی طرف سے اکثر خلعت و انعام ملے ۔ اکثر قصیدوں کے صلے میں ہاتھی اور گاؤں بھی عطا کیے گئے ۔ بہادر شاہ بہت عزت کرتے تھے اور محل کے اندر آرام کے وقت بھی ان کو آنے کی اجازت تھی ۔ انیس ۱۹ سال کی عمر میں خاقانی ہند کا خطاب ملا ۔ پھر ملک الشعراء ہوئے ۔

ذوق کو فارسی ، عربی کے علاوہ دوسرے علوم پر کافی دسترس حاصل تھی ، حکمت کا مطالعہ اچھا رہا ۔ اس کے ساتھ ان کو اُستاد نصیر کی طرف سے رعایت لفظی اور تصنع کا استعمال ورثہ میں ملا تھا ۔ ان دونوں کا اثر ان کے کلام میں نمایاں ہے انھوں نے قصیدہ گوئی میں نام پیدا کیا ، ان کے قصیدوں میں اس کی ساری خوبیاں موجود ہیں ، بیان میں زور ہے ، تشبیہ اور استعاروں کی کثرت ہے ۔ مبالغہ ہے جو

اس زمانے کے قصیدہ میں عام طور سے پایا جاتا ہے۔

صنعت مراعاۃ النظیر کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے بیشتر جگہ اپنے علوم کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے جگہ جگہ پر مختلف علوم کی اصطلاحات اور تلمیحوں سے مدد لی ہے، اکثر بہت مشکل ردیفوں میں شعر کہنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئے اس لئے ان کے کلام میں آورد زیادہ ہے، دلی کیفیات کا اظہار کہیں نہیں ملتا، غزلوں کے مضامین بالکل رسمی ہیں۔ البتہ زبان پختہ ہے۔ الفاظ پر پوری قدرت حاصل ہو۔ مشکل سے مشکل مضمون کو سخت سے سخت زمین میں آسانی سے ادا کر دیتے ہیں، جن سے ان کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ذوق ایک کہنہ مشق شاعر تھے، فن شاعری میں تجربہ اور مہارت کی بدولت انھیں یہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ کلام میں دلی کی ٹکسالی زبان ملتی ہے۔ الفاظ کی بندش سادہ ہے، سلاست اور روانی ہے، مضامین کو بہت صفائی اور مختصر الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں، لیکن ان کے یہاں مضامین میں جدت اور تنوع نہیں ہے بلکہ پرانے مضامین کو نئے پیرایہ میں بیان کیا ہے، ان کے کلام میں سوز و گداز اور درد و تاثیر کم ہے، ظاہرا طور پر واعظانہ رنگ غالب ہے۔ غالب اور مومن کے ہمعصر تھے۔

نمونۂ کلام

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

سامنے چشم گہر بار کے کہہ دو دریا
چڑھ کے گر آئے تو نظروں سے اتر جائیں گے

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ڈسا ہو کالے نے جس کو کافر تو وہ فسوں کے اثر سے کھیلے
دہان و گیسو کا تیر سے مارا نہ منھ سے بولے نہ سر سے کھیلے

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

قصیدہ

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

رتا ہے ہلال ابروئے پرخم سے اشارہ
ساقی کو کہ پھر بادہ سے کشتی طلائی

رتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشانی
کرتی ہے نسیم آکے کبھی لخلخہ سائی

رائش گلشن کے لئے جامہ رنگیں
زیبائش غنچہ کے لئے تنگ قبائی

ے نرگس شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل
برگ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

مرزا غالب

ولادت ۱۷۹۶ء —————— وفات ۱۸۹۶ء

نام خواجہ اسداللہ ۔ گھر پر مرزا نوشہ کے نام سے پکارے جاتے تھے، اسد
در غالب تخلص کرتے تھے، بعد میں جب مغل دربار سے وابستہ ہوئے تو نجم الدولہ اور
دردبیر الملک خطاب بھی حاصل ہو گئے تھے۔ غالب آگرہ کی مردم خیز سرزمین میں پیدا
ہوئے، ان کے آبا و اجداد ایبک ترکمان تھے، مرزا کے دادا ہندستان آئے اور
شاہ عالم بادشاہ دہلی کے دربار میں ملازم ہو گئے، ان کے والد عبداللہ بیگ فوج
میں ملازم تھے اور الور میں ایک لڑائی میں اس وقت مارے گئے جب غالب کی عمر
صرف پانچ سال کی تھی، غالب کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے غالب کی تعلیم و تربیت
اپنے ذمہ لی لیکن چار سال بعد انھوں نے بھی انتقال کیا۔ غالب نے اسی لئے یہ دعویٰ
کیا ہے ع

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

دہلی میں شعر و ادب کا بہت چرچہ تھا، غالب آگرہ ہی میں شاعری شروع
کر چکے تھے، دہلی پہنچ کر شاعری اوڑھنا بچھونا بن گئی، غالب کی تعلیم کے متعلق تفصیل سے
حالات نہیں معلوم لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس وقت کے مروّجہ علوم پڑھے تھے اور
شعر و ادب سے خاص طور سے دلچسپی تھی غالب کا بیان ہے کہ انھوں نے فارسی

ایک ایرانی سے پڑھی جو اتفاقاً ہندوستان آگیا تھا، اور جس کا نام ملا عبد الصمد تھا، غالب کی تعلیم جیسی بھی ہوئی ہو، انھوں نے دہلی میں اپنے لئے نہ صرف شعرار کی صف میں جگہ بنالی تھی بلکہ علمار کی بزم میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، دلی میں غالب کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، اس میں سب سے بڑی دشواری مالی مشکلات تھیں، غالب کے دوستوں نے ان کی برابر مدد کی، وہ بھی دوستوں اور شاگردوں پر اپنی جان چھڑکتے تھے۔ بعض ذی اثر دوستوں کی وساطت سے دہلی کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہو گئے، اور اس تاریخ کا ایک حصہ فارسی میں لکھ کر پیش بھی کیا، غدر میں جب دہلی لٹی تو غالب پر بھی بہت سی مصیبتیں آئیں، غالب کے خطوط میں ان کا تفصیلی حال دیکھا جاسکتا ہے۔ غدر کے بعد غالب کا تعلق رام پور کے دربار سے ہو گیا اور وہاں سے انھیں تا عمر سو روپے اور کبھی اس سے زیادہ ماہانہ ملتا رہا۔ آخر عمر میں غالب کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی ۱۸۶۹ء میں تہتر سال کی عمر میں انتقال کیا اور درگاہ خواجہ نظام الدین اولیار میں دفن ہوئے۔

غالب کی ذات ایک انسان کی حیثیت سے، ایک شاعر کی حیثیت سے، ایک نثر نگار کی حیثیت سے اور اردو اور فارسی پر یکساں قدرت رکھنے کی وجہ سے ہر شخص کو متوجہ کرتی ہو، اردو دنیا میں بہت کم ادیب ہیں جن کی شاعری اردو شاعری کے بہترین نمونے اور جن کی نثر اردو کی اعلیٰ ترین نثر کی حیثیت سے پیش کی جاسکتی ہے، کیا نظم اور کیا نثر، کیا غزل اور کیا قصیدہ ہر جگہ غالب کا رنگ نیا، انداز بیان اچھوتا اور نقطہ نظر مجتہدانہ ہے۔ وہ فطرت انسانی کے بہت بڑے نباض اور رفتار وقت کے بہت

بڑے واقف کار تھے، جو بھی ان کی شاعری کا مطالعہ کرے گا اُسے فوراً اندازہ ہو جائیگا کہ غالب تجربات کا خزانہ اپنے پاس رکھتے تھے۔

غالب کی اردو شاعری کے کئی رنگ ہیں، شروع میں مشکل فارسی آمیز زبان استعمال کرتے تھے خیالات فلسفیانہ، مشکل الفاظ اور انوکھی تشبیہات و استعارات میں کھو جاتے تھے، اِن اشعار کا سمجھنا آسان نہیں، لیکن بعد میں جب خیالات پختہ ہوئے تو وہ زبان آسان استعمال کرنے لگے۔ شگفتگی بڑھ گئی، لطافت اور مزے میں اضافہ ہوا۔ غیر مانوس ترکیبوں کی جگہ خوبصورت الفاظ اور فقروں نے لی نازک خیالی کے باوجود سادہ الفاظ سے کام لینے لگے، ان کے مزاج میں جو شوخی اور حرارت تھی اس نے ان کے مشکل سے مشکل شعر کو خوبصورت بنا دیا ہے۔ وہ نہ تو کسی کے مقلد تھے نہ کسی کو سند کے طور پر تسلیم کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے لئے نئی راہ نکالی، نظم و نثر دونوں میں فرسودہ راستہ کو چھوڑ کر اپنا رنگ آپ نمایاں کیا۔ ان کی شاعری جادو کی طرح متاثر کرتی ہے اور انسان ان کی بات سُن کر یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ بات اس کے دل میں بھی ہے لیکن اسے اس طرح نہیں کہہ سکتا، غالب نے اردو غزلوں کے علاوہ، قصیدے، قطعات اور بعض موضوعات پر نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں سے ہر ایک اُردو شاعری میں اہم جگہ کی مالک ہیں۔

نمونۂ کلام

مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

تو اور آرائشِ کاکل   میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے   کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نیند اُسکی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُسکی ہیں   تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز   پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لئے

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی

سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست   لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

وفا کیسی، کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

چمن میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لئے ہوتے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

قباحت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

کوئی مرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

مومن دہلوی

ولادت ۱۷۹۹ء —————— وفات ۱۸۵۱ء

آپ کے والد کا نام حکیم غلام نبی خاں تھا، ان کے دادا حکیم نامدار خاں کا تعلق کشمیر کے معزز خاندان سے تھا، سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں جاگیر پائی، انگریزوں کی حکومت ہوئی تو ان کی پنشن مقرر ہو گئی۔ مومن کی ولادت کوچہ چیلان دہلی ۱۷۹۹ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ سے حاصل کی۔ بچپن سے بہت ذہین تھے حافظہ اچھا تھا، عربی میں کامل استعداد حاصل کرنے کے بعد اپنے والد اور چچا سے طب پڑھی، نجوم کا شوق ہوا تو اس میں مہارت تامہ حاصل کی، علم رمل کے استاد فن تھے، شطرنج کا بہت شوق تھا اور بہت کھیلتے تھے۔

قدرت نے شعر و شاعری کا ملکہ ان کی فطرت میں ودیعت کیا تھا، آواز میں درد اور اثر تھا، بڑے وجد آفریں لحن میں پڑھتے تھے، ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھاتے تھے، طبیعت میں شوخی اور رنگینی تھی۔

مومن خاں نہایت آزاد مزاج اور زندہ دل تھے، امیروں اور رئیسوں کی خوشامد اور درباداری سے ان کو نفرت تھی، کبھی کسی کی شان میں مدحیہ قصیدہ نہیں لکھا۔

خصوصیات کلام: ۔ مومن کا کلام نازک خیالی، معنی آفرینی اور جدت طرازی کے لئے مشہور ہے، واردات قلبیہ کے نظم کرنے میں ان کو کمال حاصل ہے اسلوب بیان میں ندرت ہے، غالب کی طرح مومن پر بھی فارسی کا اثر غالب ہے ان کے کلام میں فارسی

کے سبب سے کہیں کہیں گرانی پیدا ہو گئی ہے لیکن اسی کے ساتھ ترکیبیں نہایت دلچسپ اور دل پذیر استعمال کی ہیں، طرز بیان کی جدت، استعارات و تشبیہات کی ندرت معاملہ بندی ان کے کلام کے اجزائے خصوصی ہیں۔

ضیا بدایونی "شارح" "دیوان مومن" میں لکھتے ہیں کہ "یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ صدق جذبات اور ندرت اسلوب میں کوئی استاد مشکل سے مومن کا ہمسر ہوگا۔ مومن کی شاعری میں جو ہمہ گیری ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو، ان کا کلام شعر کی تمام اصناف سخن پر حاوی ہے اور اس میں ایک طرف نازک خیالی کے جلوے نظر آتے ہیں دوسری طرف معاملہ بندی کے"

مومن کو نجوم میں ید طولیٰ حاصل تھا، ان کی پیشین گوئیاں بہت صحیح ثابت ہوتی تھیں، مرنے سے پانچ سال قبل حکم لگایا تھا کہ پانچ دن، پانچ ماہ یا پانچ سال بعد مرجاؤں گا۔ اور یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ کوٹھے سے اتفاقیہ گرے اور پانچویں دن رحلت کر گئے، تاریخ وفات خود کہہ دی کہ "دست و بازو بشکست"

نمونۂ کلام

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

اللہ رے گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں آتا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومنؔ خدا کو بھول گئے اضطراب میں

اب شور ہے مثال جو دی اس خرام کو
یوں کون جانتا تھا قیامت کے نام کو

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو
عذر کچھ چاہیئے ستانے کو
برق کا آسماں پر ہے دماغ
پھونک کر میرے آشیانے کو

میر انیس

ولادت سنہ ۱۸۰۲ء

وفات سنہ ۱۸۷۴ء

ببر علی نام ، انیس تخلص ، میر خلیق مشہور مرثیہ گو کے بیٹے ہیں۔ ۱۸۰۲ء
میں فیض آباد میں پیدا ہوئے ، ابتدائی تعلیم اپنی والدہ محترمہ سے حاصل کی اور فن شعر میں
اپنے والد ہی سے مستفیض ہوئے ، دیگر علوم مولوی سید حیدر علی لکھنوی سے سیکھے۔ آپ فن سپہ گری
کے بھی ماہر تھے ، لکھنؤ کے مشہور اور ماہر سپہ گر میر امیر علی کی شاگردی کا فخر حاصل ہے
میر انیس بہت ہی خود دار اور پابند وضع تھے ، غدر تک نہایت سکون سے زندگی بسر کی
روسا اور عوام ان کی بہت قدر کرتے تھے ، ان کی مجلسوں میں ہزاروں کا مجمع ہوتا
تھا، ان کے حریف مرزا دبیر تھے ، ان کا الگ ایک گروہ تھا، صرف دونوں استادوں
ہی میں نہیں بلکہ ان کے ماننے والے گروہوں میں بھی سخت مقابلہ ہوتا تھا، ان کے
ماننے والے سارے ہندستان میں موجود تھے ، آج بھی اس خیال کے لوگ موجود ہیں
غدر کے بعد جب لکھنؤ تباہ ہو گیا تو انیس کو بہت اصرار کے بعد پٹنہ عظیم آباد اور حیدر آباد
بھی جانا پڑا۔ ہر جگہ خیر مقدم ہوا۔ بقول مسعود حسن رضوی " میر انیس نہایت خوش آواز
آدمی تھے اور جتنے خوش آواز تھے اس سے کہیں زیادہ خوش بیان تھے ، وہ مرثیہ
اس طرح پڑھتے تھے کہ کلام کا اثر بدرجہا بڑھ جاتا تھا ، ایک ایک اشارے سے واقعات
کی تصویر کھینچ دیتے تھے ، عام طور پر مسلم ہے کہ میر انیس کا سا مرثیہ پڑھنے والا آج تک
پیدا نہیں ہوا "

میر صاحب کا انتقال لکھنؤ میں ۱۸۷۴ء میں ہوا

میر انیس مرثیہ گوئی میں بلند ترین مقام پر فائز ہیں، انھوں نے اس صنف سخن کو وسعت کی آخری حد تک پہنچایا، مرثیہ کو فن کے لحاظ سے کئی ٹکڑوں میں تقسیم کیا ہے۔ چہرہ، سراپا، آمد، رجز، جنگ، فتح یا شکست اور بین ان کے مرثیوں کے مدارج ہیں کردار نگاری، ان کا ایک اور کمال ہے، انھوں نے خاندان اہل بیت کے ہر فرد کی شخصیت کو الگ الگ نمایاں کیا ہے، ان کی جسمانی ساخت، طرز گفتگو، آداب مجلس، تہذیب اخلاق کو بہت تفصیل سے پیش کیا ہے، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی نفسیات کا ہر موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ جہاں وہ اپنے پورے معنی ادا کرتے ہیں، اسی لئے ان کے یہاں محاکات کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں، وہ ایسے ایسے مناظر الفاظ میں پیش کرتے ہیں جن کو ایک مصور بھی نہیں پیش کر سکتا ہے۔ مرقع نگاری انھیں کا حصہ ہے جس جگہ کا سماں کھینچ دیا ہے وہ ہو بہو آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔

کلام میں نازک خیالی کوٹ کوٹ کر بھری ہے، فصاحت و بلاغت کا ان پر خاتمہ ہے۔ سادہ اور سلیس الفاظ میں وہ روانی بھر دیتے ہیں کہ کہیں زبان کو لکنت نہیں ہوتی، اسی کے ساتھ ترنّم اور موزونیت کی اتنی کثرت ہے کہ بند کے بند حفظ زبان ہو جاتے ہیں۔

ان کے مرثیے نظم نگاری کا بیش خیمہ ہیں۔ ان میں غزل، قصیدہ اور مثنوی کی لفظی اور معنوی خصوصیات ایک ساتھ پائی جاتی ہیں۔

انیس نے سلام اور رباعی میں بھی وہی مرتبہ حاصل کیا ہے جو ان کو مرثیہ میں ملا ہے۔

نمونۂ کلام

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم
مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم

وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ نورِ صبح اور وہ صحرا وہ سبزہ زار
تھے طائروں کے غول درختوں پہ بیشمار

چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار
کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار

وا تھے دریچے باغ بہشت نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی جو تاں
چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں

اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں
ڈانڈا آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں

بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی پسٹ گیا

وہ لو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب

خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے تھے جو حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب

اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

مرزا دبیرؔ

ولادت ۱۸۰۳ء ———— وفات ۱۸۷۵ء

نام مرزا سلامت علی، تخلص دبیر۔ دبیر دہلی میں پیدا ہوئے۔ صاحبِ علم و فضل تھے اور درس و تدریس، بحث و مباحثہ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ میرؔ ضمیر کے شاگرد تھے اور بہت جلد ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے مشہور ہو گئے، بادشاہ اور اُمرا بھی ان کا مرثیہ سُننے کے مشتاق تھے، جب میر انیسؔ فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو دونوں اُستادوں میں اکثر شاعرانہ چشمک رہتی تھی اور معرکے گرم ہوتے تھے، مرزا دبیرؔ قانع انسان تھے۔ لکھنؤ کے باہر سے دعوتیں آتی رہتی تھیں مگر وہ لکھنؤ ہی میں رہنا پسند کرتے تھے۔ غدر کے بعد مرشد آباد اور پٹنہ مجلسیں پڑھنے گئے، ضعف بصارت کے علاج کے لئے کلکتہ بھی گئے اور واپس آکر ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ ہی میں انتقال کیا اور اپنے مکان ہی میں دفن ہوئے

مرزا دبیرؔ بہت پُر گو شاعر تھے۔ انھوں نے ساری عمر مرثیہ نگاری کی، اور ایک اُستادِ کامل سمجھے گئے، ان کی تخئیل بلند، الفاظ شاندار اور تشبیہیں نئی ہوتی ہیں، لیکن ان کا زیادہ تر کلام رعایت لفظی سے بھرا ہوتا ہے، ان کے مرثیوں کے مطالعے سے ان کے علم و فضل کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے۔

نمونۂ کلام

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی — پنہاں درازیٔ پرِ طاؤس شب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیٰ زہرہ لقب ہوئی — مجنوں صفت قبائے سحر چاک شب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخ ہنرمند کے لئے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

نکلا اُفق سے عابدِ روشن ضمیرِ صبح — محرابِ آسماں ہوئی جلوہ پذیرِ صبح
کھولا سپیدی نے جو مصلائے پیرِ صبح — ہر سجدہ گاہ بن گئی مہرِ منیرِ صبح
کرتی تھی شب غروب کا سجدہ ودود کو
سیارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہو گیا — پھر مشکِ شب جہاں سے کافور ہو گیا
گویا کہ زنگ آئینہ سے دور ہو گیا — باطل رسالۂ شبِ دیجور ہو گیا
کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں
مضمون آفتاب تھا ذرّوں کے نامے میں

ے تھے جوڑ توڑ غضب تیغ تیز کو — سر سے ملی جدا کیا پائے گریز کو
پنے سے گرم دیکھ کے اس شعلہ ریز کو — برق و شرر نے نذر کیا جست و خیز کو
و گُل نے رنگ لالہ نے سرعت ہوا نے دی
یہ ہدیہ کیا ہے اپنی نیابت قضا نے دی

دیا شنکر نسیم

ولادت ۱۸۱۱ء وفات ۱۸۴۳ء

نام دیا شنکر کول۔ تخلص نسیم۔ باپ کا نام پنڈت گنگا پرشاد کول ہے۔ ذات کے کشمیری برہمن تھے، ۱۸۱۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، دستور کے مطابق ابتداء میں عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی، سید امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی فوج میں بخشی گیری کے عہدہ پر متعین تھے، لکھنؤ شعر و شاعری کا گہوارہ تھا، نسیم نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں، طبیعت شاعری کی طرف مائل ہوئی اور مشق سخن شروع کر دی، خواجہ حیدر علی آتش کی شاگردی اختیار کی، تھوڑے ہی عرصہ میں انکی شہرت ہونے لگی مگر دست اجل نے گلستان اردو کے اس نونہال کو پھولنے پھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ۱۸۴۳ء کو صرف ۳۲ سال کی عمر میں دنیا سے چل بسے

کلام میں پختگی ہے۔ صنائع و بدائع کا استعمال بڑی خوبی سے کیا، واقعہ نگاری، منظر کشی، مضمون آفرینی اور سلاست و روانی ان کے کلام کا خاص حصہ ہے، غزلوں کا ایک دیوان بھی ہے لیکن ان کی شہرت کا سبب مثنوی "گلزار نسیم" ہے جس میں گل بکاؤلی کا قصہ نظم کیا ہے، اپنی خوبیوں کے باعث اردو ادب میں ایک معرکۃ الآراء کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ قصہ نثر میں کئی بار لکھا جا چکا تھا اور بہت مقبول تھا، اس لئے نسیم نے اسے نظم کا جامہ پہنانے کے لئے منتخب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مثنوی بہت طویل تھی، آتش نے مشورہ دیا کہ اسے مختصر کریں۔ چنانچہ اسی اختصار کی وجہ سے اس میں دلکشی

پیدا ہوئی ہے بعض حضرات اسے آتش کی لکھی ہوئی مثنوی کہتے ہیں، یہ صحیح نہیں، ایک زمانہ میں اس مثنوی پر چکبست اور مولانا شرر میں بڑی بحثیں ہوئیں، اور وہ پنچ اخبار نے بھی اس میں حصہ لیا۔ اب ساری بحث "معرکہ چکبست و شرر" میں اکٹھا کر دی گئی ہے۔
نسیم کی غزلیں بھی دلچسپ ہوتی ہیں۔

نمونۂ کلام

گل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بلبل خار نعرہ زن ہے
گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا — اور غنچۂ صبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاؤلی گل اندام
جاگی مرغ سحر کے غل سے — اٹھی نکہت سی فرش گل سے
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل — سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد انھیں سولی پہ چڑھانا
تھرائیں خواصیں صورت بید — ایک ایک سے پوچھنے لگیں بھید
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں — سوسن نے زباں درازیاں کیں
پتا بھی پتے کو جب نہ پایا — کہنے لگی کیا ہوا خدایا
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون — بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون

شبنم کے سوا چرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس
غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار پڑا نہ تیرا چنگل
مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

بلبل تو چہک اگر خبر ہے
گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد
تھا دم بخود اس کی سن کے فریاد

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

(مثنوی گلزار نسیم)



محسن کاکوروی

ولادت ۱۸۲۷ء
وفات ۱۹۰۵ء

محمد محسن نام، محسن تخلص اور کاکوری ضلع لکھنؤ وطن تھا، کم عمری ہی میں عربی و فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی۔ ۹ سال کی عمر سے شاعری شروع کی، کچھ دنوں عدالت میں ناظر رہے، پھر پرائیویٹ طور سے قانون پڑھ کر امتحان وکالت پاس کیا اور آگرہ میں پریکٹس کرتے رہے، گورنمنٹ نے منصفی کا عہدہ پیش کیا لیکن آپ نے قبول نہیں کیا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں آگرہ سے کاکوری چلے آئے اور غدر کی شورشیں ختم ہونے کے بعد مین پوری میں بڑی کامیابی سے وکالت کرتے رہے، انتقال سے تین سال قبل وکالت چھوڑ کر وطن میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

محسن اردو کے بلند مرتبہ نعت گو شاعر تھے، ان کے نعتیہ قصائد اردو ادب میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ بلندی مضامین، شکوہ الفاظ اور چستی بندش اُن کے قصائد کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ قرآن و حدیث کی تلمیحات کے بڑے شائق تھے اور حمد و نعت میں مقام عبد و معبود کا پورا لحاظ رکھتے تھے۔ ان کی شاعرانہ شوخی حدود تہذیب و متانت میں محدود رہتی تھی۔ بدیہہ گوئی میں مشہور تھے اور پیش پا افتادہ مضامین سے گریز کرتے تھے، ہندی الفاظ کا استعمال بڑی خوبی اور کثرت سے کرتے تھے۔

نمونۂ کلام

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل

خبر اُڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی — کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل

تشِ گُل کا دھواں بامِ فلک تک پہنچا — جم گیا منزلِ خورشید کی چھت میں کاجل

اغ میں ابر سیہ مست چڑھ کر آیا — جام خورشید مئ میکدہ بُرج حمل

مئے گل رنگ ہی کیا شمع شبِ فکر کا پھول — چلتے چلتے جو قلم ہاتھ سے جاتا ہے نکل

رتے پڑتے ہوئے دیوانہ نے کہاں کھا پاؤں — کہ تصور بھی وہاں جا نہ سکے منھ کے بل

یعنی اُس نور کے میدان میں پہنچا کہ جہاں — خرمنِ برق تجلّی کا لقب ہے بادل

ار باران مسلسل ہے ملائک کا درود — پئے تسبیح خداوندِ جہاں عزّ و جل

ہیں طوبیٰ، کہیں کوثر، کہیں فردوسِ بریں — کہیں بہتی ہوئی نہرِ لبن و نہرِ عسل

ہیں جبریل حکومت پہ کہیں اسرافیل — کہیں رضواں کا کہیں ساقیٔ کوثر کا عمل

کنزِ مخفی کے کسی سمت نہاں تہ خانے — اک طرف مظہر قدرت کے عیاں شیش محل

باغ تنزیہہ میں سرسبز نہالِ تشبیہ — انبیا جس کی ہیں شاخیں عرفان ہیں کونپل

گُلِ خوش رنگ رسولِ مدنی عربی — زیبِ دامانِ ابد طرۂ دستارِ ازل

نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر — نہ کوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل

منتخب نسخۂ وحدت کا یہ تھا روزِ ازل

کہ نہ احمد کا ہے ثانی نہ احد کا اوّل

شانہ حضرتؐ کا ہے تشدید دو لام و اللیل — صاد مازاغ بصر سُرمۂ چشمِ اکحل

آرزو ہے کہ رہے دھیان ترا تا دمِ مرگ — شکل تیری نظر آئے مجھے جب آئے اجل

صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو تیرا مداح — ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل

کہیں جبریلؑ اشارے سے کہ ہاں بسم اللہ — ”سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل“

اختر

ولادت ۱۸۲۷ء ——— وفات ۱۸۸۷ء

واجد علی نام، اختر تخلص، اودھ کے آخری تاجدار تھے، ایام ولیعہدی میں "جان عالم" لقب تھا۔ ۱۸۴۷ء میں تخت نشین ہوئے تو "سلطان عالم" لقب اختیار کیا۔ رنگین مزاج اور زندہ دل تھے، تمام اصناف فنون لطیفہ، موسیقی مصوری، سنگ تراشی، عمارت سازی اور بالخصوص شعر و شاعری کا بہت شوق تھا، جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی، قصیدہ، مثنوی، غزل، مرثیہ، ٹھمری، گیت اور دادرہ سب ہی میں اپنی وسیع یادگاریں چھوڑ گئے۔ نظم و نثر میں بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن کی تعداد ۴۰ تک پہنچتی ہے۔ یہ سب کتابیں خود اپنے خاص مطبع میں چھاپ کر شائع کی تھیں۔ سوائے چند کے اب سب ہی نایاب ہیں۔

اختر کے کلام میں رعایت لفظی کے ساتھ بندش مضامین کی چستی ملتی ہے، عام طور سے سوز و گداز کی کمی اور عیش و عشرت کے خیالات کی فراوانی، سلاست بیان شیرینی زبان اور فصاحت کے جوہر ہیں۔ مثنوی "حزن اختر" میں لکھنؤ سے کلکتہ تک کے سفر کا حال مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے اور انتزاع سلطنت کے واقعات پُر درد لہجے میں نظم کئے گئے ہیں۔

———

نمونۂ کلام

قطعہ

یہ تمنا نہ رہے زیست میں اے بارِ خدا — پھر مجھے لکھنؤ دنیا میں دکھائے غربت
ہاں وطن دیکھوں تو شاداں ہو دلِ زار مرا — یہ بھی ممکن ہے کہ روتے کو ہنسائے غربت
وسعتِ خلد سے بڑھ کر ہے کہیں حبِّ وطن — تنگیٔ گور سے بدتر ہے فضائے غربت

یوں تو شاہانِ جہاں پر ہے پڑا وقت مگر
ختم ہے اخترِ بےکس پہ جفائے غربت

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

زلف رخسار پہ رہتی ہے پریشاں تا چند — دیکھ کھنچتا ہے یہ طولِ شبِ ہجراں تا چند
کب تلک عمر بسر کیجیے صحرا میں یاد — پھاڑیئے جوش میں وحشت کے گریباں تا چند

خالِ ہندو سے بھی چھوٹے گا یہ دیندارِ قرآں؟ — تبر کا فر میں رہے گا یہ مسلماں تا چند

چاک دل کی دوا کہاں اختر — اس کا بخیہ نہ ہوگا سوزن سے

امیرؔ مینائی

ولادت ۱۸۲۸ء
وفات ۱۹۰۰ء

نام امیر احمد ۔ تخلص امیر باپ کا نام کرم محمد ۔ ۱۸۲۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۔ سلسلۂ نسب لکھنؤ کے مشہور بزرگ مخدوم شاہ مینا سے ملتا ہے، اسی نسبت سے وہ اپنے کو مینائی لکھتے تھے ۔ بڑے پرہیزگار، خدا پرست اور صوفی منش انسان تھے، طبیعت میں حد درجہ انکسار تھا ۔

ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، پھر مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں تحصیل علوم کے لئے داخل ہوئے اور عربی و فارسی میں بڑی مہارت حاصل کی، طب اور نجوم سے بھی واقف تھے ہوش سنبھالا تو لکھنؤ کا گلستان شاعری بہار پر تھا، آتشؔ و ناسخؔ، انیسؔ و دبیرؔ کی نغمہ سرائیوں کی دھوم تھی ۔ شعر گوئی کا ملکہ پیدائشی تھا، مشق سخن شروع کی اور مظفر علی خاں اسیرؔ کے شاگرد ہوئے، خداداد ذہانت کام آئی اور شعر گوئی میں کمال حاصل کیا، بادشاہ اودھ واجد علی شاہ اختر کے دربار میں رسائی ہو گئی ۔ بادشاہ کی فرمائش پر دو کتابیں "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" لکھ کر پیش کیں ۔ کافی انعام و اکرام ملا تقریباً بیالیس ۴۲ سال رام پور میں رہے، نواب مرزا خاں داغؔ بھی وہیں تھے، آپس میں بڑا خلوص تھا اور دوستی تھی داغؔ حیدر آباد گئے تو امیر مینائی کو بھی بلوا لیا، مگر وہاں کی آب و ہوا سازگار نہ آئی جاتے ہی علیل ہوئے اور ایک ماہ نو روز بعد ۱۹۰۰ء میں انتقال فرمایا ۔ امیر مینائی نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں مثنوی نور تجلی، دیوان مراۃ الغیب

ابرکرم، صنم خانۂ عشق، مسدس صبح ازل، شام ابد، بہت مشہور ہیں۔

امیر کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے، ذوق سخن بہت پاکیزہ تھا۔ حسن و عشق کے جذبات کو بڑی خوبی سے نظم کرتے، کلام میں تصوف کا رنگ بھی ہے خیالات میں گہرائی اور جذبات و احساسات میں رنگینی و ندرت ہے، جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ قصائد و مثنویات پر بھی قدرت تھی لیکن غزلیات کا پایہ بلند ہے۔

نمونۂ کلام

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر ۔۔۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لئے ۔۔۔ ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لئے

حور ہے یارب جو مومن کے لئے ۔۔۔ بھیج دے دنیا میں دو دن کے لئے

یہ آتا ہے جی میں کہ کوثر پہ چلئے ۔۔۔ خرابات میں دور کی سوجھتی ہے

ایک جھونکے میں بس ادھر سے ادھر ۔۔۔ چار دن کی بہار ہے دنیا

انگور میں تھی یہ شے پانی کی چار بوندیں ۔۔۔ پر جب سے کھنچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ ۔۔۔ مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے

نہ گھبرا اے دلِ واماندہ اب منزل قریب آئی
اسی بستی کے آگے اور آباد ایک بستی ہے

تری مسجد میں واعظ خاص ہیں اوقات رحمت کے
ہمارے میکدے میں رات دن رحمت برستی ہے

نہ شاخِ گُل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چمن بُلبل
تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

حقیقت آج تک بُت کی نہیں معلوم زاہد کو
خدا کی شان اس پر دعویٰ ایزد پرستی ہے

جھڑ گئی افشاں جبیں پر کچھ ستارے رہ گئے
آسمانِ حُسن پر گنتی کے تارے رہ گئے

وائے قسمت وہ بھی کہتے ہیں بُرا
ہم بُرے سب سے ہوئے جن کے لئے

پی بھی لے زاہد جوانی میں شراب
عمر بھر ترسے گا اس دن کے لئے

لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیر
آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے

امیر جمع ہیں احباب حالِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

صیاد اِدھر خلاف اُدھر باغباں امیر
ہم بارِ خاطرِ قفس و آشیاں رہے

داغؔ دہلوی

ولادت ۱۸۳۱ء ——— وفات ۱۹۰۵ء

نواب مرزا خاں نام، تخلص داغؔ، باپ کا نام - نواب شمس الدین ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، ابھی سات برس کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، ماں نے آخری تاجدار مغلیہ بہادر شاہ ظفر کے لڑکے مرزا فخرو سے شادی کر لی، اس تعلق کے باعث داغؔ کو تعلیم و تربیت میں بڑی آسانیاں حاصل ہوئیں، قلعہ معلی میں شعر و سخن کا بڑا چرچا تھا، بادشاہ اور شہزادے سب ہی شعر کہتے تھے، داغؔ کو تعلیم و تربیت میں بھی قدرت نے شعر گوئی کی استعداد ودیعت کی تھی، قلعہ کی صحبتوں میں یہ ذوق اُبھرا اور کم عمری ہی میں اچھے شعر کہنے لگے، شیخ ابراہیم ذوق جو بادشاہ کے اُستاد تھے ان ہی کی شاگردی داغؔ نے بھی اختیار کی، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں دہلی پر تباہی آئی تو داغؔ رام پور چلے گئے وہاں کے فرمانروا نواب یوسف علی خاں نے ان کو اپنی نگرانی میں لے لیا، ان کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی داغؔ کی قدر دانی کی اور ان کو اپنا خاص مصاحب بنایا - ۲۴ سال یہ خدمت انجام دی - اس وقت رام پور بلند پایہ شعرا کا مرکز تھا۔ بڑے اچھے اور پاکیزہ مشاعرے ہوتے تھے جن کو انتظام ریاست کی طرف سے داغؔ کرتے تھے، چالیس سال رام پور میں رہ کر حیدر آباد چلے گئے اور نظام دکن میر محبوب علی خاں کے اُستاد مقرر ہوئے - اٹھارہ سال حیدر آباد میں رہے، ۱۷ - فروری ۱۹۰۵ء کو مرض فالج میں انتقال کیا۔

داغ اُردو غزل گوئی میں اپنی نظیر آپ تھے، دیگر اصنافِ سخن پر بھی ان کو قدرت حاصل تھی، مضمون کی شوخی و رنگینی، زبان کی شستگی، بیان کی ندرت اور برجستہ گوئی انھیں کا حصّہ ہے۔

نمونۂ کلام

پوچھتا جا مِرے مرقد سے گزرنے والے
کیا گزرتی ہے تری جان پہ مرنے والے

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

تھک گیا درد بھی اُٹھتے اُٹھتے
اب کلیجے میں رہا جاتا ہے

کیا تصوّر بھی نہ آنے دے گی
منھ تو دیکھوں شبِ تنہائی کا

ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا نگاہِ اُلفت کبھی نہ کرنا
تمھیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

ے خانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ

ہر شخص پوچھتا تھا کہ حضرت اِدھر کہاں

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں

مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

لُطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد — ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

خوش نوائی نے رکھا ہم کو اسیر صیاد — ہم سے اچھے رہے صدقے میں اُترنے والے

یہ پوچھتا جا مرے مرقد سے گزرنے والے — کیا گزرتی ہے تری جاں پہ مرنے والے

تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں — تجھے ہر بہانے سے ہم دیکھتے ہیں

تیری صورت کو دیکھتا ہوں میں — اُس کی قدرت کو دیکھتا ہوں میں

تری یاد ہے یا ہے تیرا تصور — کبھی داغ کو ہم نے تنہا نہ دیکھا

جو وہ نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا — تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

محمد حسین آزاد

ولادت ۱۸۳۲ء
وفات ۱۹۱۰ء

نام محمد حسین۔ تخلص۔ آزاد، باپ کا نام محمد باقر۔ دہلی میں پیدا ہوئے مولوی محمد باقر دہلی کے شرفا میں سے تھے اور اپنے زمانہ کے ایک با اثر عالم اور مجتہد سمجھے جاتے تھے، آزاد نے دلّی کالج میں تعلیم پائی اور شیخ ابراہیم ذوق کے زیر تربیت ادبی مذاق کی نشو و نما ہوئی۔

غدر میں آزاد کے والد شہید ہو گئے اور گھر بار لُٹ گیا، آزاد بے سرو سامانی کی حالت میں صرف ذوق کا بچا کھچا کلام لے کر نکل پڑے، دہلی سے لکھنؤ اور دکن گئے، پھر ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچ کر سر رشتۂ تعلیم میں پندرہ روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے، درسی کتابیں لکھ کر انھوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی، آزاد کو کچھ ہندوستانی اور انگریز ایسے مل گئے جس کی وجہ سے انھیں اپنی صلاحیتیں نمایاں کرنے کا موقع ملا۔ چنانچہ ۱۸۶۵ء میں کلکتہ پھر کابل اور بدخشاں سفر کرنے کا موقع ملا، بعد میں ایران بھی گئے، ان سیاحتوں سے انھیں زبانوں کے مطالعہ کا کافی موقع ہاتھ آیا۔

جب انجمن پنجاب قائم ہوئی جس نے اردو میں نظموں کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی، آزاد نے اس میں بڑا حصہ لیا اور ۱۸۷۴ء میں حالی کے ساتھ مل کر اردو شاعری کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کیا۔ آزاد "اتالیق پنجاب" اور "پنجاب میگزین" کے سب اڈیٹر بھی رہے اور آہستہ آہستہ اردو ادب کے رہنماؤں میں شمار کئے جانے

، گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی کی پروفیسری بھی آزاد نے کی اور ۱۸۸۷ء میں
س العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۸۸۹ء میں آزاد کی دماغی شکایتیں شروع ہوئی اور اپنی
ی بیٹی کے انتقال پر وہ بالکل ہی ہوش و حواس کھو بیٹھے لیکن جنون کی حالت میں
ی کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ بیس سال سے زیادہ اسی حالت میں بسر کرنے کے بعد
۱۹۱۰ء میں آزاد نے لاہور ہی میں انتقال کیا، درسی کتابوں کے علاوہ آزاد نے
ت اہم تصانیف چھوڑی ہیں جن میں "آب حیات"، "دربار اکبری"
رنگ خیال" اور "سخندان فارس" بہت اہم ہیں۔

آزاد، سرسید، حالی، نذیر احمد اور شبلی کے ساتھ اردو کے عناصر خمسہ میں شمار
جاتے ہیں، ان کی زندگی زبان و ادب کے ایک ایسے طالب علم کی زندگی تھی جو
اری عمر زبان کی خدمت ایک مذہبی اور مقدس فرض کی طرح انجام دیتا رہے، اس ذوق
ر لگن کے ماتحت انھوں نے اردو کے دامن کو نئے علمی خزانوں سے مالا مال کر دیا، وہ
بی فارسی کے عالم تھے، بھاشا اور ہندی سے واقف، انگریزی ادب کی خوبیوں سے
شنا تھے، گو انھوں نے انگریزی پڑھی نہ تھی لیکن "نیرنگ خیال" میں بعض ترجمے دیکھ کر
ن کے صاحب ذوق ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ اردو لسانی تحقیق کی
ر قدم اٹھایا، تمثیلی قصے لکھے اور زبان کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی۔

آزاد نے شاعری بھی کی، نئی شاعری کی بنیاد بھی ڈالی لیکن وہ آج بحیثیت
شاعر نہیں بلکہ اردو کے ایک بڑے محقق، انشاء پرداز اور نثر نگار کے نام سے زندہ
یں، ان کی شاعری صرف نئی ہونے کے لحاظ سے دلآویز ہے۔

نمونۂ کلام

اس تیرہ شب میں شاعرِ روشن دماغ ہے
بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے کتاب ہے

ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے
اڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پر خیال کے

لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اُتار کر
جاتا زمیں کی تہہ میں ہے پھر غوطہ مار کر
پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پہ افسوں نئے نئے
ہو جاتے ہیں پیدا اُدر مضموں نئے نئے

عالم ہے اپنے بسترِ راحت پہ خواب میں
آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں

پھیلائے ہاتھ صورتِ اُمیدوار ہے
اور کرتا صدقِ دل سے دعا بار بار ہے

مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض
رکھتا نہیں زمانہ کے جنجال سے غرض

یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

حالی

ولادت ۱۸۳۷ء ——— وفات ۱۹۱۴ء

نام الطاف حسین ۔ تخلص حالی ۔ بمقام پانی پت پیدا ہوئے ، والد کا
ال ہوگیا ، بھائیوں کے زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل کی ، ابتدائی عربی حاجی ابراہیم حسین
اور فارسی مولوی جعفر علی سے پڑھی ۔ سترہ سال کی عمر میں شادی ہوگئی ، معاشی پریشانیا
یل علم میں سدراہ ہوئیں تو دہلی چلے آئے جہاں عربی زبان کی تعلیم حاصل کی ۱۸۵۶ء
ایک معمولی ملازمت مل گئی مگر ہنگامہ غدر ۱۸۵۷ء میں ملازمت ترک کرکے وطن
گئے اور چار سال مقیم رہے ۔ اس دوران میں مطالعہ برابر جاری رہا ۔

دہلی کے دوران قیام میں مرزا غالب سے ملنے کا موقع ملا ، مرزا کی صحبت نے
کیا اور حالی کو شعر و سخن کا ذوق دامنگیر ہوا ، مرزا غالب کی ہمت افزائی نے ان کو
عر بنا دیا ، ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے شناسائی ہوئی اور آٹھ سال اُن
ن کے مصاحب رہے ، نواب صاحب کو شعر و سخن کا بڑا پاکیزہ ذوق تھا ، انکی صحبت نے
لی کی استعداد میں غیر معمولی اضافہ کیا ، شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی نے گورنمنٹ بکڈپو
ہور میں ملازمت کرلی ، یہاں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی اصلاح کا
م سپرد ہوا ، چار سال یہ کام کیا ، مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں مشاعروں کی بنیاد
الی تھی ، حالی نے بھی کئی نظمیں لکھیں اور ان مشاعروں میں پڑھیں جو بہت مقبول
وئیں ۔ چار سال کے بعد پھر دہلی چلے آئے اور اینگلو عربک کالج میں مدرس مقرر ہوئے ،

سرسید کی فرمائش پر حالی نے اپنی مشہور نظم "مسدس حالی" تصنیف کی جس نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے، سنہ ۱۹۱۰ء میں ادبی وعلمی خدمات کے صلہ میں حکومت نے آپ کو شمس العلما کا خطاب دیا اور نظام حیدرآباد نے ازراہ قدر دانی سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا، عمر کا آخری حصہ پانی پت میں بسر ہوا، اور وہیں سنہ ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔

حالی شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی، دونوں میں ان کا مرتبہ بلند نظر آتا ہے۔ حالی جدید اُردو شاعری کے بانی کہے جاتے ہیں، وہ اُردو زبان کے بڑے محسن تھے۔ تمام اصناف سخن پر ان کو کمال حاصل تھا، نئے انداز اور اسلوب بیان سے کلام کو دلکش بنا دیا، ان کا کلام صنائع وبدائع سے عاری تھا، سادگی خاص جوہر ہے۔ ان کا اُردو دیوان شائع ہو چکا ہے، مثنویاں، رباعیات اور قطعات بے مثل کہے ہیں۔

نمونۂ کلام

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں　　مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں سے

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا　　ہم محوِ نالۂ جرس کارواں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام　　کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب　　بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم　　سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل خزاں آ کے بتا دے گی وطن کس کا ہے

ریت کی سی دیوار ہے دُنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دُنیا
ساتھ سہاگ اور سوگ یہاں کا — ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے — اس نگری کی ریت یہی ہے

(مناجات بیوہ)

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا — بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کو زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

مس خام کو جس نے کندن بنایا — کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

(مسدس مد و جزر اسلام)

اکبر الٰہ آبادی

ولادت ۱۸۴۶ء — وفات ۱۹۲۱ء

نام سید اکبر حسین ، باپ کا نام سید تفضل حسین ، تخلص اکبرؔ لقب لسان العصر
۱۶۔ نومبر ۱۸۴۶ء کو موضع بارہ ضلع الٰہ آباد میں پیدا ہوئے ، ابتدائی تعلیم اسکولوں
میں حاصل کی۔ ۱۸۶۶ء میں مختار کاری کا امتحان پاس کیا اور نائب تحصیلدار ہو گئے۔
۱۸۸۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور منصف مقرر ہو گئے اور ۱۸۹۴ء میں
جج ہوئے ، خان بہادر کا خطاب ملا ۱۹۲۱ء میں انتقال ہوا۔

شعر و سخن کا فطری ذوق تھا ، ابتدا میں مولوی وحید الدین وحید شاگرد مصحفی سے اصلاح
لی ، مزاج میں شوخی و ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی ، وہی رنگ غزلوں میں بھی جھلکنے لگا
بجائے تقلید کے ایک نئے رنگ کی بنیاد ڈالی ، زبان میں سلاست و روانی ہے۔
مضمون آفرینی میں کمال حاصل ہے۔ مذہبی ، سیاسی اور معاشرتی مضامین کو ہر صنف کلام
میں بیان کرتے ہیں اور اس خوبی سے کہ شعر میں بہت اثر پیدا ہو جاتا ہے ، ان کے کلام
میں ظرافت ہے مگر مصلحانہ شان کے ساتھ ، معمولی واقعات کو بیان کر کے اس سے دور رس
نتائج پیدا کرنا انھیں کا کام ہے ، ان کا سارا کلام پند و نصائح کا مجموعہ ہے مگر اتنا دلچسپ
اور دلکش کہ آپ اپنی نظیر ہے ، اکبر قدیم تہذیب کے حامی اور جدید معاشرت کے مخالف تھے
اسی لئے انھوں نے سرسید کی تحریک کی مخالفت کی تھی ، ان کی شاعری اس ماحول کی آئینہ دار
ہے جو اس دور میں تھا ، اردو شاعری میں وہ طنز و مزاح کے "امام" تھے۔

ان کے کلام کا ذخیرہ بہت کافی ہے جس میں سے بیشتر "کلیات اکبر" کے نام
چار حصوں میں شائع ہو چکا ہے، اکبر اپنے رنگ میں یکتا تھے، ان کے بعد کوئی
رنگ کو نہ پا سکا، اُردو کے بلند پایہ ادیبوں نے اکبر اور ان کی شاعری پر بے شمار
ین لکھی ہیں، اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا، ان کی شاعری بے مقصد
ں بلکہ ایک بلند نصب العین کی حامل تھی۔

نمونہ کلام

آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام — وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ید اُٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے — شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

ٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا — ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

ھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو — بس خدا سمجھا ہے اُس نے برق کو اور بھاپ کو
رق گر جائے گی اک دن اور اُڑ جائیگی بھاپ — دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
چھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا؟ — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا!

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں — جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں

بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر — تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر — مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس

یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں — نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس

سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ — کیا ہے جس کو میں نے زیبِ قرطاس

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے — کہ بیٹا کر لے گر تو ایم۔اے پاس

تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے — بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس

کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی — کجا عاشق کجا کالج کی بکواس

کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت — کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے — ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی — مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس

دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود — نہیں منظور مغزِ سر کا آماس

یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا با حسرت و یاس

کرلی ہو میں نے خوب نئی روشنی کی جانچ — مجھ سے بہت نہ کیجیے اب آپ تین پانچ

ان لیڈروں کی شعلہ بیانی سے کیا ہوا — ہانڈی تو سرد رہ گئی مذہب پہ آئی آنچ

شاد عظیم آبادی

ولادت ۱۸۴۶ء ——— وفات ۱۹۲۷ء

نام سید علی محمد، تخلص شاد، خطاب "خان بہادر" ضلع الہ آباد میں پیدا
ئے، لڑکپن میں عظیم آباد (پٹنہ) چلے گئے۔ وہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔
لی کی ویرانی کے بعد لکھنؤ کی طرح ایک ادبی مرکز بن گیا تھا، شاد کو آغاز شباب
شاعری کا ذوق تھا، سید شاہ الفت حسین فریاد شاگرد خواجہ میر درد سے شرف
حاصل کیا اور ساری عمر شعر و سخن کی خدمت کی، تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی
یکن سب سے زیادہ شہرت غزل اور مرثیہ میں حاصل کی۔ ان کا مجموعہ "شاد" چھپ
ہے۔

شاد کے یہاں لکھنؤ اسکول کا رنگ ہے، جذبات نگاری میں میر کا رنگ غالب
ہے، صنائع و بدائع استعمال کئے ہیں، اخلاق و فلسفہ کا بھی عنصر ہے، تغزل میں
ی سادگی و متانت ہے۔ سادہ ترکیبیں اور دلکش الفاظ ہیں، دہلی اور لکھنؤ کے
و رنگوں کا حسین امتزاج ہے، جس نے کلام میں ایک انفرادیت پیدا کر دی،
اد کا نام غزل گو شعراء کی صف اول میں ہوتا ہے۔ ۱۹۲۷ء میں بمقام
ٹنہ انتقال کیا۔

نمونۂ کلام

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاؔد یہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

یوں ہی راتوں میں تڑپیں گے، یونہی جان اپنی کھوئیں گے
تیری مرضی نہیں اے دردِ دل اچھا نہ سوئیں گے

کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی
خم آئے گا، صراحی آئے گی تب جام آئے گا

میں کہاں، واعظ کہاں، توبہ کرو
جو نہ سمجھا خود وہ کیا سمجھائے گا

سُنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

پھر گئے راستے سے وہ گردِ غبار دیکھ کر
رہ گئی میری بیکسی سوئے مزار دیکھ کر

شب وعدہ ہے شانہ ہاتھ میں لے کر وہ بیٹھے ہیں
خدا ہی ہے جو آج الجھے ہوئے گیسو سنور جائیں

یکھا کئے وہ مست نگاہوں سے باربار جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے

انٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
اس پر کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

رے قربان ساقی! بزم کی ترتیب پھر کرنا ذرا مستوں کے آگے رکھ تو دے جام و سبو پہلے

مجھے تو حشر کی آتی ہے دیکھئے کیا ہو یہ ایک وعدۂ نا استوار باقی ہے

لیا تھا نام فقط عشق کا قیامت میں ہزاروں طرح کے ہم پر سوال ہونے لگے

غنچوں کے مسکرانے پہ کہتے ہیں ہنس کے پھول اپنا کرو خیال ہماری تو کٹ گئی

خموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے تڑپ اے دل تڑپنے سے ذرا تسکین ہوتی ہے

شوق قدوائی

ولادت ۱۸۵۳ء
وفات ۱۹۲۸ء

نام شیخ احمد علی، تخلص شوق، وطن قصبہ جگور، ضلع بارہ بنکی (اودھ)
شاعری میں منشی مظفر علی اسیر لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ ایک زمانہ میں لکھ
سے ایک اخبار بھی نکالتے تھے لیکن بعد میں بھوپال اور وہاں کے بعد ریاست را
میں ملازم ہو گئے، رام پور میں "حامد اللغات" کی تدوین میں مدد کرنے کا کام ان کے
سپرد ہوا۔

شوق کو ڈرامہ اور مثنوی نگاری سے خاص دلچسپی تھی۔ انھیں جذبات نگاری
میں کمال حاصل تھا، خاص کر عورتوں کے جذبات بڑی دلکشی سے نظم کرتے تھے ا
سلسلہ میں ان کی نظم "عالم خیال" بہت مشہور ہے۔ ان کی زبان سلیس، سادہ
عام فہم، بامحاورہ اور رواں ہے۔ ان کا انداز بیان مثنویوں کے لئے موزوں ہے
ان کے یہاں حقیقت نگاری کے عنصر ملتے ہیں۔ ان کی مشہور نظموں میں ڈرامہ
"قاسم وزہرہ"، "مثنوی ترانۂ شوق" ہیں۔ انھوں نے ایک طویل نظم میں سائنس
اور مذہب کے مسائل بھی نظم کئے ہیں۔ بعض مثنویات بہت مقبول ہیں۔

نمونۂ کلام

وہ مستیٔ حسن۔ بوئے بادہ
سر پیش کرے سبوئے بادہ

کیا رنگ کہوں شگفتگی کا
اک پھول کھلا ہے چاندنی کا

آنکھیں ہیں بیاضِ سحر خوانی　　یا ساغرِ بادۂ جوانی

جادو ڈالیں تو صاف چل جائے　　رنگ ابلق دہر کا بدل جائے

چتون سے عیاں ہے خوش کلامی　　کہئے آنکھوں کو شرحِ جامی

کیا وصف دہن میں کیجئے فکر　　جو چیز نہیں ہے اس کا کیا ذکر

گر شمع سے دوں مثال گردن　　ہو شمع کو سرو بالی گردن

یا مے ہے بھری میانِ شیشہ　　یا لال پری میانِ شیشہ

موہوم ہے وہ کمر یہاں تک　　صانع نے دیا ہے نقطۂ شک

اک زلف کا بال ہے کمر کیا　　شاعر کا خیال ہے کمر کیا

ستارِ عیوب کی قسم ہے　　دو ہستیوں میں نہاں عدم ہے

رخِ برگ نہیں ہے زرد کیوں ہے　　دل برف نہیں ہے سرد کیوں ہے

چہرے پہ غبار چھا گیا کیوں　　آئینے پہ رنگ آ گیا کیوں

تصویر کی حیثیت دل میں جا ہو　　بُت ساکنِ خانۂ خدا ہو

پھل نخلِ جنوں کے ہل رہے ہیں　　کلیوں میں شگوفے کھل رہے ہیں

برسے گا اگر گھرا ہے بادل　　پھولا ہے شجر تو لائے گا پھل

غنچہ ہے تو ہوگا پھول گر گُل
سُلجھے گی اُلجھ گئی جو کاکُل

نظم طباطبائی

ولادت ۱۸۵۳ء ——— وفات ۱۹۳۳ء

نام سید علی حیدر، تخلص نظمؔ، خطاب نواب حیدر یار جنگ، باپ کا نام میر مصطفےٰ حسن طباطبائی تھا، لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم لکھنؤ ہی میں ہوئی منشی مینڈو لال زارؔ سے علم عروض اور ملا طاہر صرفی سے عربی اور خاتم الدین سے درس نظامی کا نصاب پڑھا، شہزادہ کام بخش کے معلّم کی حیثیت سے مٹیا برج گئے، [illegible] میں جب واجد علی شاہ کا انتقال ہوگیا تو آپ میر فضل حسین صاحب میر مجلس عدالت العالیہ حیدرآباد دکن کی تحریک سے حیدرآباد تشریف لے گئے اور کتب خانہ آصفیہ کے معتمد مقرر ہوگئے، اس کے بعد نظام کالج کے پروفیسر مقرر ہوئے اور تقریباً تیس سال تک کالج میں رہے۔ کچھ عرصہ شاہزادگان نظام کے اُستاد رہے، پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں ناظر ادبی مقرر ہوئے۔

نظمؔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں "شرح دیوان غالبؔ"، "شرح [illegible]"، "تعریب الاطفال"، "مبنیات"، "معربات" اور "نظم طباطبائی" آپ کی خاص تصنیفات ہیں۔

نمونۂ کلام

کہاں تک راستہ دیکھا کریں ہم برق خرمن کا
لگا کر آگ دیکھیں گے تماشا اب نشیمن کا

تجھے یکتا سمجھ کر ناز یکتائی اُٹھاتا ہوں　　　وگرنہ میں بتا دیتا جو کوئی دوسرا ہوتا

تجھے اے خطیب چمن نہیں خبر اپنے خطبۂ شوق میں
کہ کتابِ گُل کا ورق ورق تری بیخودی سے بکھر گیا

فلک اندر فلک ہے کائنات اس بزم عالم کی　　　مئے عشرت کا پیمانہ حباب اندر حباب آیا

قدم سے طاقتِ رفتار کچھ کہتی ہے رہ رہ کر
میں اب جھک جھک کے چلتا ہوں کہ سُن لوں کیا جواب آیا

نہ جانے کس بیاباں مرگ نے مٹی نہیں پائی　　　بگولے جا رہے ہیں کارواں در کارواں ہو کر

جاتا رہا شباب رہا غم شباب کا　　　باقی رہا عذاب قیامت نہیں رہی

ریاض خیرآبادی

ولادت ۱۸۵۳ء
وفات ۱۹۳۴ء

نام ریاض احمد، تخلص ریاض ۔ خیرآباد ضلع سیتاپور (اودھ) میں پیدا ہوئے ۔ امیر مینائی کے شاگردوں میں ریاض خیرآبادی منفرد حیثیت کے مالک تھے، ذوق شاعری فطری تھا، اُستاد کی شفقت اور توجہ نے ریاض کو ریاض سخن کا معیاری باغباں بنا دیا۔

ریاض نے رندانہ مضامین بڑی شوخی سے نظم کئے ہیں، عاشقانہ معاملات نہایت دلکش پیرایہ میں ادا کئے ہیں ۔ زبان حوض کوثر سے دُھلی ہوئی، روزمرہ اور محاورہ، فصاحت و سلاست کا نمونہ ہے، کہیں کہیں رندانہ شوخی، گستاخی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

کلام میں رندی و مستی، کیف و سرور اس قدر زیادہ ہے کہ ان کا کلام "خمریات ریاض" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

نمونۂ کلام

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات
اللہ رے شغل زاہدِ شب زندہ دار کا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش   سُن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

مر گئے پھر بھی تعلق ہے یہ مے خانے سے
میرے حصے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے

جامِ مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن   سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

سایۂ تاک میں واعظ کو جگہ دی ہم نے
آج شیشہ میں اُسے ہم نے اُتارا کیا

جہاں ہم خشتِ خُم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

توبہ سے ڈرایا مجھے ساقی نے یہ کہہ کر
توبہ شکنی کے لئے اصرار نہ ہوگا

صفی

ولادت ۱۸۶۲ء ——————— وفات ۱۹۵۰ء

نام سید علی نقی، تخلص صفی، ۱۸۶۲ء میں بہ مقام لکھنؤ پیدا ہوئے فارسی، عربی کی تعلیم سے فارغ ہو کر انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور انٹرنس پاس کر کے ملازم ہو گئے، ۱۹۲۳ء میں پنشن لی۔

صفی نے طالب علمی کے زمانہ سے شاعری شروع کر دی تھی، یہ وہ زمانہ تھا کہ لکھنؤ میں شعر و شاعری کا چرچا گلی گلی میں ہو رہا تھا، صفی کا شمار بھی لکھنؤ کے رنگ شاعری کے مصلحین میں ہوتا ہے، یہ اثر غزلوں میں تو زیادہ نمایاں نہ ہو سکا لیکن انکی نظموں میں ہر جگہ ظاہر ہے، وہ لکھنؤ میں اور لکھنؤ کے باہر کی ادبی تحریکات سے متاثر ہو رہے تھے اور شروع ہی سے غزل گوئی کے ساتھ نظم نگاری پر بھی مائل تھے ان کی بہترین نظمیں وہ ہیں جو انھوں نے قومی مسائل سے متاثر ہو کر لکھی ہیں اور گو بہ ظاہر وہ وقتی اور عارضی موضوعات سے متعلق معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کے خلوص اور انداز بیان نے ان میں جان ڈال دی ہے، وہ اُردو شاعری کے بہت بڑے رکن زبان کے مسلم الثبوت ماہر اور قادر الکلام شاعر تھے، انھوں نے تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔

صفی کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں "تنظیم الحیات" کے نام سے ... گ، مثنوی بھی شائع ہوئی ہے جس پر انھیں حکومت یو۔پی کی طرف سے انعام بھی ملا

تھا، عمر کے آخری دس سال انھوں نے عمر خیام کی رباعیوں کی صحیح تشریح اور ترجمہ پر صرف کیے۔

آپ بہت علم دوست، فراخ دل، پُرگو اور خوش اخلاق تھے، ۲۷ جون سنہ ۱۹۵۰ء کو انتقال کیا۔

نمونۂ کلام

قابل دید ہے سرسبزی ایام بہار
ل گیا سبزۂ خوابیدہ کو پیغام بہار

ساغرِ گُل کہ چھلکتا ہے کوئی جام بہار
ہو گیا چار طرف نام خدا نام بہار

آسماں سبز، زمیں سبز، در و بام ہیں سبز
اثرِ پرتوِ مینا سے خط جام ہیں سبز

دیکھیے فلسفیانہ تو نباتات کا جوش
پیکرِ روح نباتی میں ہے ذرات کا جوش

ہر طرف جوش بہار اور یہ برسات کا جوش
اُف کسی حُسن خود آرا کے خیالات کا جوش

یہ سلیقہ کہیں نیچر کو تھا گُل کاری میں؟
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں!

ہم آئینے میں رُخ کی جھریاں دیکھا کیے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کیے

رہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے
آشیاں اُجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے

بستیاں ویراں ہوئیں آباد ویرانے ہوئے
شعبدے تیرے ہی اے آسماں دیکھا کیے

تھے اک آئینۂ عبرت کسی کی بزم میں
مہرباں دیکھا کیے نامہرباں دیکھا کیے

تیتلی

اے جامہ زیب تیتلی!
خوش رنگ نظر فریب تیتلی!

آرزو

ولادت ۱۸۷۳ء ———— وفات ۱۹۵۲ء

سیّد انور حسین نام، تخلص آرزو، لکھنؤ وطن، لکھنؤ کی ٹکسالی زبان، اور اُس لکھنؤ اسکول کی شاعری کے آخری نمایندہ تھے، جس پر دہلی اسکول کا اچھا اثر پڑ چکا تھا، اسی لئے ان کے کلام میں خارجی لوازمات کے ساتھ ساتھ داخلی محاسن بھی پائے جاتے ہیں، آرزو جملہ اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے لیکن غزل کے میدان میں زیادہ ترقی کی، زبان شیریں اور صاف تھی، شوخی اور معاملہ بندی کلام میں چار چاند لگا دیتی تھی، محاورات ضرب الامثال کے استعمال پر بھی بڑی قدرت تھی، آرزو نے عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ کو ترک کر کے روزمرہ کی زبان میں شاعری کی۔ اگرچہ وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہے لیکن بعض جگہ اس غیر فطری کوشش سے پھیکا پن پیدا ہو گیا جس سے تصنع اور آورد کا پتہ چلتا ہے۔

آرزو نے گیت بھی لکھے ہیں جو بہت مقبول ہوئے، ان کے کلام میں موسیقیت بھی بہت ہے۔

نمونۂ کلام

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر ——— اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

معصوم نظر کا بھولا پن للچا کے لبھانا کیا جانے ——— دل آپ نشانہ بنتا ہے وہ تیر چلانا کیا جانے

چٹکی جو کلی، کوئل کوکی، اُلفت کی کہانی ختم ہوئی　　کیا کس نے کہا، کیا کس نے سُنی، یہ بات زمانہ کیا جانے

مبارک اسے نگاہِ یاس پہلی فتح کا سہرا　　چڑھی تیوری نے اک ذرا تل کی تھرا کر کمائی کھو دی

اب آرزو اس پھلواری میں بسنے کا سہارا کوئی نہیں

دو سوکھے تنکے لا کے رکھو، تو وہ بھی جلائے جاتے ہیں

وہ اس کا پاس کچھ اپنے کئے کی حشر میں شرم　　کہ یہ بھی کہہ نہ سکے، دلربا نے لوٹ لیا

کچھ کہتے کہتے اشاروں میں شرما کے کسی کا رہ جانا

وہ میرا سمجھ کر کچھ کا کچھ جو کہنا نہ تھا سب کہہ جانا

چپکے چپکے آخر طے ہوا کیا غمزۂ دل سے　　نگاہیں مل کے رخصت ہو رہی ہیں اہلِ محفل سے

مند ہواؤں پر بنیاد ہے طوفاں کی　　یا تم نہ حسیں ہوتے یا میں نہ جواں ہوتا

رق چشمِ ساقی کے فدا اپنے تصور کے　　جب آنکھیں بند کر لیں ایک پیمانہ بنا ڈالا

سرور جہان آبادی

ولادت ۱۸۷۳ء۔ وفات ۱۹۱۰ء، نام درگا سہائے، تخلّص سرور جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں پیدا ہوئے، بچپن ہی سے شاعری کی طرف میلان تھا، شروع میں مولوی کرامت حسین بہار سے مشورۂ سخن کیا، پھر بیان یزدانی میرٹھی کو اپنا کلام دکھانے لگے، دور جدید کے ایک اہم اور ہونہار شاعر تھے مگر کثرت شراب نوشی کی وجہ سے جوانی ہی کے عالم میں ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔

ان کا کلام نئے اور پرانے رنگ کا مجموعہ ہے، ایک طرف تو انھوں نے قدیم شعرا کی بلند خیالی اور پاکیزگی کو برقرار رکھا، دوسری طرف انگریزی کے اثر سے نیچرل شاعری کی طرف مائل ہوئے اور مناظر فطرت کے علاوہ ایسے موضوعات پر نظمیں لکھتے رہے جنھیں قدما اہمیت نہیں دیتے تھے، حالی اور آزاد وغیرہ نے جو تحریک چلائی تھی سرور اس سے متاثر ہوئے تھے، حب الوطنی سے ان کا کلام مالا مال ہے۔ چونکہ ان کے جذبات میں بڑی شدت اور مزاج میں بڑی وارفتگی تھی اس لئے سیدھی سادی معمولی باتوں کو بھی بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرتے تھے۔ ان کی کئی مشہور نظمیں مثلاً "دیوار کہن" "بیر بہوٹی"۔ "حسرت شباب"۔ "مرغان قفس"۔ "یاد طفلی"۔ اور "ماتم آرزو" وغیرہ اس جذبات نگاری کی اچھی مثالیں ہیں۔

حب الوطنی سے متعلق نظموں کی تعداد بھی بڑی ہے، عاشقانہ اور تاریخی نظمیں بھی اعلیٰ خیالات، پاکیزہ جذبات اور انوکھے انداز بیان کا مرقع ہیں، بعض نظموں میں مناظر کی

مصوری نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کی ہے۔ بعض انگریزی نظموں کو اُردو کا لباس پہنایا ہے

سرور کے مجموعے "خم خانہ سرور" اور "جام سرور" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

نمونۂ کلام ——— بیر بہوٹی

ہ او ننھے سے کیڑے نازشِ صحرا ہے تو — دشت میں اک سُرخ چھوٹا سا گلِ رعنا ہے تو

صفحۂ ہستی پہ اک نقشِ تحیر زا ہے تو — شعلہ زارِ حُسن کی چھوٹی سی اک دنیا ہے تو

برقِ عالم سوز کی ننھی سی مشعل ہے کوئی

آتشِ یاقوت کی چھوٹی سی منقل ہے کوئی

کچھ عجب عالم ہے تیرے حُسن کے انداز کا — سُرخ ڈورا ہے کسی چشمِ فسوں پرداز کا

قطرۂ مضطر ہے خونِ کشتگانِ ناز کا — قلبِ خوں گشتہ ہو مژگاں پر کسی جانباز کا

یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمیں پر جلوہ گر

جامِ زریں میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر

گلِ بداماں ہے کوئی دوشیزۂ کمسن مگر — ہلکی پھلکی سُرخ پھولوں کی ہے چادر دوش پر

وقفِ رعنائی ہے یا کوئی عروسِ سیم بر — روئے زیبا پہ ہے غازہ سُرخ جوڑا زیب بر

لوٹتا ہے کوئی بسمل سبزۂ بیگانہ پر

یا مئے گلگوں کا قطرہ ہے لبِ پیمانہ پر

جلوۂ گل سے ہے نرگس روئے زیبائے بہار — نازمیں ہے یا کوئی محوِ تماشائے بہار

یا مئے گل رنگ سے گلگوں ہے مینائے بہار — یا ہے آغشتہ بخوں داغِ سویدائے بہار

سبزۂ کہسار نے یا لعل اُگلا ہے کوئی

چُن رہی ہے پھول یا دوشیزۂ رعنا کوئی

ڈاکٹر اقبالؔ

ولادت ۱۸۷۵ء

وفات ۱۹۳۸ء

شیخ محمد اقبال کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے ہیں، ان کے جدّ اعلیٰ مسلمان ہو گئے تھے، آپ ۱۸۷۵ء میں بہ مقام سیالکوٹ پیدا ہوئے، ابتداءً ایک مکتب میں تعلیم پائی، اس کے بعد انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا، اس کے بعد مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہو گئے۔ وہاں شمس العلماء مولانا سید میر حسن صاحب جیسے متبحّر سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا، اسکے بعد آپ لاہور گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے اور وہاں سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں اعزاز کے ساتھ حاصل کیں اور ان کی علمی شہرت ہوئی، پھر آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہو گئے، کچھ مدت تک یہ خدمت انجام دینے کے بعد ولایت تشریف لے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ کی ڈگری حاصل کی، پھر جرمنی کی میونگ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی (پی۔ ایچ۔ ڈی) کی ڈگری حاصل کی اور وہاں سے لندن واپس آکر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۰۸ء میں ہندستان تشریف لے آئے۔

اقبال کی شاعری کی ابتدا ان کی طالب علمی کے زمانہ سے ہوئی جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں طالب علم تھے تو ان کی شعر گوئی کا چرچا ہو گیا تھا، اسی زمانہ میں لاہور کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے رہے، داغؔ دہلوی سے اصلاح لینے لگے۔

۱۸۹۹ء میں آپ نے "نالہ یتیم" کے عنوان سے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں ایک نظم پڑھی یہ نظم بہت مقبول ہوئی اور اقبال کی شہرت ہر طرف پھیلنا شروع ہو گئی سفر یورپ سے واپسی کے بعد فارسی میں زیادہ شعر کہنے لگے، اقبال نے اپنے کلام سے ملی تحریکوں میں جان ڈالی۔ اپنی قوم کو ماضی کی حیرت انگیز داستانیں سنائیں اور ان کو درس عمل دیا۔ اقبال کی شاعری کی اہم ترین خصوصیت ان کی جدت پسندی اور اجتہاد ہے ان کے یہاں میر کا سوز و گداز ہے، غالب کی جدت ہے اور ذوق کی روانی، ان کے یہاں تغزل بھی ہے اور شوکت الفاظ بھی، ان کی بندشیں نہایت دل نشین اور چست ہوتی ہیں خیالات میں بلندی اور گہرائی ہے، فلسفیانہ حقائق ہیں اور رموز تصوف کا سرمایہ بھی ہے، زور بیان اور فراوانی جذبات کا سرچشمہ ہے، معانی اور مطالب سے لبریز تر، ترکیبیں نادر اور شگفتہ استعارے ان کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

اقبال نے دنیا کے تمام ممتاز شعراء سے استفادہ کیا۔ وہ ایک زبردست مفکر اور فلسفی تھے، انھوں نے معرفت نفس اور خودی کو مادی و روحانی ترقیات کی بنا قرار دیا۔ اقبال کے کلام میں تخیل کی بلندی بھی ہے اور سوز و گداز بھی، ان کا کلام فلسفیانہ ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ مسلمان قوم میں ایک بیداری کی لہر پیدا کر دی، انھوں نے مغربی تہذیب و تمدن کے عیوب و نقائص کی پردہ دری کی، نوجوانوں کو حریت استقلال، عزم و ہمت کا درس دیا۔

اقبال کو جو شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی، وہ کم لوگوں کے حصے میں آئی، دنیا کے ممتاز شاعروں اور مفکروں کی صف اول میں ان کا شمار ہوتا ہے، اقبال کا اردو فارسی کلام مکمل شائع ہو چکا ہے، "بانگ درا"، "بال جبریل"، "ضرب کلیم" اور "ارمغان حجاز"

ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو اس شاعر مشرق حکیم الامت علامہ اقبال نے علی الصباح داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور لاہور کی مشہور شاہی مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے دفن کیے گئے، جہاں اب ان کی قبر پر جدید طرز کی ایک چھوٹی مگر بہت خوشنما عمارت تعمیر ہو چکی ہے۔

نمونۂ کلام

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

شاعر کی صدا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

اٹھا نہ شیشۂ گران فرنگ کے احساں
سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو   یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل

عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ترے شیشہ میں مے باقی نہیں ہے   بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے؟

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم   بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

خدائی اہتمام خشک و تر ہے   خداوندا خدائی دردِ سر ہے

ولیکن بندگی استغفراللہ!   یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو

کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

کیوں زیاں کار بنوں، سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ترے مجبور بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

حسرت موہانی

ولادت ۱۸۷۵ء ـــــــــــ وفات ۱۹۵۱ء

نام سید فضل الحسن، تخلص حسرت۔ قصبہ موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔

خود کہتے ہیں ؎

عشق نے جب سے کہا حسرت مجھے
کوئی کہتا ہی نہیں فضل الحسن

آپ کے والد کا نام سید اظہر حسین ہے، ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی اور ۱۹۰۳ء میں علیگڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا۔ شروع ہی سے شاعری کا ذوق ہوگیا اور اپنا کلام تسلیم لکھنوی کو دکھانے لگے، آپ کو سیاست سے خاص دلچسپی رہی تحریک آزادی کے سلسلہ میں متعدد بار قید ہوئے، ہندستانی پارلیمنٹ کے ممبر رہے، آپ کو مطالعہ کا شوق بہت زیادہ تھا، خاص کر پرانے ادب کا مطالعہ بہت غور سے کیا، بہت سادہ زندگی بسر کی، حق گو، نڈر اور بیباک رہے، طبیعت میں شوخی اور شگفتگی تھی،

کلام میں اُستادوں کا رنگ بہت کم ہے، وہ نمائشی چیزوں کے قائل نہیں ہیں، مزاج اور فکر پختہ تھی، دلی کیفیات اور جذبات کے ماہر نبض شناس تھے، انھوں نے اردو غزل کو ایک خاص رنگ بخشا ہے، ان کی شاعری قدیم اور جدید خیالات کی ایک ساتھ ترجمانی کرتی ہے، دورِ جدید کے شاعر ہوتے ہوئے وہ میر اور غالب سے متاثر ہیں ان کے کلام میں درد اور تاثیر کی کثرت ہے، ہجر اور فراق اور رنج و غم کے مضامین کے

ساتھ شوخی اور رشک و حسرت کے مضامین بالکل جدید رنگ میں پیش کئے گئے ہیں ان کے کلام میں تنوع ہے، ان کی غزلوں میں صرف تغزل ہی نہیں بلکہ سیاسی خیالات اور موجودہ زندگی کے مسائل بھی پائے جاتے ہیں۔

آپ غزل گو شاعر ہیں اور "امام المتغزلین" کی حیثیت رکھتے ہیں، الفاظ بہت سادہ سلیس اور ان کی بندش میں چستی اور روانی ہوتی ہے۔ حسن و عشق کے مضامین کو ملائم اور سبک الفاظ میں بیان کرنا ان کا کمال ہے۔ ان کا کلام شائع ہو چکا ہے۔

نمونۂ کلام

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

اب عشق کو درکار ہوا اک عالمِ حیرت
کافی نہ ہوئی وسعتِ میدانِ تمنا

رندوں نے پچھاڑ کر پلا دی
واعظ کے نہ چل سکے بہانے

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

انھیں حالِ دل ہم سناتے رہے
وہ خاموش گیسو بناتے رہے

وہ بار بار سزا جرمِ شوق پر دیتے
مگر قصور وہی بار بار ہم کرتے

بات کیا ہے جو ہوئے جاتے ہو تم یوں ہی خفا
مجھ کو دیکھو نہ مرے دل کا دھڑکنا دیکھو

شکرِ الطاف نہیں شکوۂ بیداد نہیں
کچھ نہیں تیری تمنا کے سوا یاد نہیں

گیسوئے دوست کی خوشبو ہو دو عالم کی مراد
آہ وہ نکہت برباد کہ برباد نہیں

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی
روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

ہم رضا شیوہ ہیں تاویلِ ستم خود نہ کریں
کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی

یہ بھی آدابِ محبت نے گوارا نہ کیا
انکی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی

عطا ہو اس دغا دشمن کو توفیقِ کرم یارب
نہیں تو پھر مجھی کو بے نیازِ مدعا کر دے

گراں گزریگا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر
نگاہِ شوق اس مفہوم کو رنگیں ادا کر دے

اب غریبوں پر بھی ساقی کی نظر پڑنے لگی
بادۂ پس خوردہ ہم کو بھی عطا ہونے لگا

مولانا محمد علی جوہر

ولادت ۱۸۷۸ء

وفات ۱۹۳۱ء

نام محمد علی، تخلص جوہر، رام پور کے رہنے والے تھے علیگڑھ کالج میں تعلیم حاصل کی، شعر و سخن سے فطری لگاؤ تھا اور میدان سیاست کے زبردست شہسوار تھے لیکن ساتھ ساتھ گلستان شعر و سخن میں بھی گل چینی کرتے رہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم کی تکمیل کی، قوم و ملک کے سچے رہنما تھے، آزادی کا حریت کے علمبردار، رئیس الاحرار، ہمدرد اور کامریڈ کے اڈیٹر، خوش فکر شاعر اور بلند پایہ انشاپرداز، بہت کم اشعار کہے مگر جو کچھ ہیں وہ انتخاب ہیں، درد، کسک، سچائی، اور اثر ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے، کلام میں آمد ہی آمد ہے، روانی اور جوش ہے، فصاحت و بلاغت بھی ہے۔ قومی اور سیاسی تحریک میں کئی بار اسیر فرنگ ہوئے ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے وہیں انتقال ہوگیا بیت المقدس میں دفن ہوئے جو مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے اور کئی برگزیدہ پیغمبروں کی آرام گاہ ہے، مولانا کا یہ شعر خاص و عام کی زبان پر ہے۔

قتل حسینؑ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

نمونۂ کلام

یاد وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور — جاتی نہیں ہر بوئے چمن کیا چمن سے دور
ہم تک جو دور جام پھر آئے تو کیا عجب — یہ کچھ نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور

ہر رنگ میں راضی برضا ہو تو مزا دیکھ — دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ
جو حسن طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا — ہو صدق طلب پھر اثر آہ رسا دیکھ
ہے سنت ارباب وفا صبر و توکل — چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامان رضا دیکھ

کیا ڈھونڈتے ہو فصلِ خزاں میں بہار کو — اب وہ چمن کہاں ہے وہ رنگِ چمن کہاں

ہم کو تو ایک تجھ سے دو عالم میں ہے غرض — سب بدگماں ہوا کریں تو بدگماں نہ ہو
اب تو جو مہرباں ہو تو ہر اک ہو مہرباں — اور یوں نہ ہو بلا سے کوئی مہرباں نہ ہو

اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل — "ھل من مزید" کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

جس کو دنیا نے نامراد کیا — وہی ناکام کام کرتا ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے

فانیؔ بدایونی

ولادت ۱۸۷۹ء ——— وفات ۱۹۴۱ء

نام شوکت علی خاں، تخلص فانیؔ۔ بدایوں میں پیدا ہوئے، ان کے جدِ امجد کابل سے آکر ہندوستان میں سکونت گزیں ہوئے تھے،

فانیؔ کے والد محمد شجاعت علیخاں محکمۂ پولیس میں انسپکٹر تھے، انھوں نے اپنے بڑے بیٹے کو وکالت کا آزاد پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا لیکن فانیؔ کو اوائل عمر سے شعر و سخن کا ذوق تھا، اس لئے انھوں نے وکالت کی طرف کبھی خاص توجہ نہیں کی۔

فانیؔ کے کلام میں حزن و یاس کی فراوانی ہی۔ اسی لئے انھیں یاسیات کا امام کہا جاتا ہے، ان کے حزن و ملال میں بھی ایک دلکشی ہے، بعض بعض جگہ انھوں نے غالب کی طرح فلسفہ طرازی بھی کی ہے جس کی وجہ سے بعض اشعار بہت بلند ہو گئے ہیں، بحیثیت مجموعی ان کا مرتبہ سخنورانِ عصرِ جدید میں بہت بلند ہے۔

فانیؔ کا ایک نیا مجموعہ "وجدانیاتِ فانیؔ" کے نام سے بھی شائع ہوا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ آخر زمانہ میں ان کے کلام میں اُستادانہ پختگی اور ہمہ گیری آگئی تھی۔

نمونۂ کلام

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا ۔۔۔ زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا ۔۔۔ بات پہنچی تری جوانی تک

غلط انداز نگاہوں کو سنبھال — میری گستاخ نگاہی کو نہ پوچھ

گناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل — غریب کشمکش جبر و اختیار میں ہے

مرکے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قید حیات — مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

منزلِ عشق پر تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی

تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

نسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے — دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید — کچھ اب کی بوئے کفن دامن بہار میں ہے

(رباعی)

بجھتی ہی نہیں شمع جلی جاتی ہے — کٹتی ہی نہیں رات ڈھلی جاتی ہے

جاری ہے نفس کی آمد و شد فانی — سینے میں چھری ہے کہ چلی جاتی ہے

ں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات — جب مزاج حسن کچھ برہم نظر آیا مجھے

پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا — جب ذکر بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی

اللہ رے سکون قلب اس کا دل جس نے لاکھوں توڑ دیئے

جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

سیماب

ولادت ۱۸۸۰ء ——— وفات ۱۹۵۱ء

نام عاشق حسین، تخلص سیماب، اکبر آباد (آگرہ) کے رہنے والے تھے، عربی و فارسی کے عالم، اُردو کے اچھے ادیب اور بلند مرتبہ شاعر تھے، آپ کو شاعری کا ذوق ابتدا ہی سے تھا، کمسنی ہی سے موزوں اشعار کہنے لگے تھے، آنکھیں کھولیں تو حضرت داغ دہلوی کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا، انھیں کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے شروع میں رنگ تغزل غالب رہا لیکن رفتہ رفتہ نظم کی طرف متوجہ ہوگئے اور نظم میں آپ کی فکر رسا کو بلند پروازیوں کے لئے کافی وسعتیں مل گئیں۔

آپ کی نظمیں زیادہ تر اصلاحی و سیاسی ہوتی ہیں، ہندستان کی "تحریک آزادی" کے لئے جن شاعروں کی قلمی خدمات تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں اُن میں سیماب صاحب کا نام بھی کافی اہمیت رکھتا ہے ——— آپ کے کلام میں سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ الفاظ پر بڑی قدرت ہے، مشکل بحروں میں بھی صفائی و سادگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ——— چھوٹے بچوں کے لئے بھی نظمیں اور گیت لکھے ہیں، کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں "سازو آہنگ" کافی مقبول ہوا ——— آپ کے کلام میں منظر کشی اور واقعہ نگاری کی بھی اچھی مثالیں موجود ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا ترک وطن کر کے کراچی چلے گئے تھے اور وہیں ۳۰۔ جنوری ۱۹۵۱ء کو

ل ہو گیا۔

مولانا سیماب بڑے خوش اخلاق، عالی حوصلہ اور مخلص انسان تھے، ساری زندگی زبان اور ادب کی خدمت کرتے رہے، آگرہ سے ایک ماہانہ علمی و ادبی رسالہ "شاعر" جس نے اُردو زبان اور شاعری کی بڑی خدمت کی اور اب تک کر رہا ہے حضرت ب کا نام اردو ادب اور شاعری کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

نمونۂ کلام

مردانگی کا دم بھرا کرتے ہیں — وہ ہنستے کھیلتے مرا کرتے ہیں
ہو موت تو اک زندگیٔ نو کا پیام — بزدل کہیں موت سے ڈرا کرتے ہیں

دل جس نے محبت سے یہاں جیت لئے — اس نے در اصل دو جہاں جیت لئے
دل توڑ دیا شکست کامل پائی — دل جیت لیا کون و مکاں جیت لئے

برہم نظام عالمیاں دیکھتا ہوں میں
یہ کیا تغیرات یہاں دیکھتا ہوں میں

برپا سمندروں میں ہیں طوفان آگ کے
موج ہوا کو شعلہ فشاں دیکھتا ہوں میں

بے رُت کے بادلوں کی طرح ہر طرف محیط
مظلومیت کے دل کا دُھواں دیکھتا ہوں میں

عزیز لکھنوی

ولادت ۱۸۸۲ء ——————— وفات ۱۹۳۵ء

۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے، عزیز اردو شاعری میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی شاعری قدیم اور جدید دونوں طرز کا سنگم ہے۔

عزیز کے اسلاف شیراز سے کشمیر آئے، پھر لکھنؤ پہنچے، عزیز نے تحصیل علم پر پوری توجہ کی اور خاندانی علم و فضل کو قائم رکھا۔ فارسی میں حافظ، عرفی، اور نظیری کا رنگ پسند تھا اور اردو میں میر اور غالب کا، عزیز زمانہ شناس تھے، اُنھوں نے قدیم راستے چھوڑ کر اُردو شاعری کو فرسودگی اور ابتذال کے گرداب سے نکالا اور طرزِ ادا کی ندرت، خیال کی بلندی اور ایک نئی معنویت سے غزل کو چار چاند لگا دیئے۔

عزیز نے قصیدے بھی لکھے اور اس میں شک نہیں کہ مردہ صنفِ سخن میں جان ڈال دی ہے۔ ہر قصیدے میں الفاظ کا شکوہ اور تخیل کی بلندی ملتی ہے، ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

نمونۂ کلام

خدا محفوظ رکھے عشق کے جذبات کامل سے

زمیں گردوں سے ٹکرائی جہاں دل مل گیا دل سے

فنا پذیر ہوئے نقش سب زمانے کے
رہا تو داغ محبت ہی یادگار رہا

جیتے ہیں کیوں وہ جن کو آتا نہیں ہے جینا
مرتے ہیں کیوں وہ جن کو آتا نہیں ہے مرنا

بجلی سی ایک سامنے آکر نکل گئی
کیا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی

یہ مختصر سی مری سرگزشت ہستی ہے
ہمیشہ وقف ستم ہائے روزگار رہا

جب کوئی ظلم وہ ایجاد کیا کرتے ہیں
عمر رفتہ تجھے ہم یاد کیا کرتے ہیں

آپ جب آئیں تو مشکل مری آساں کیوں ہو
وقت آخر کوئی شرمندہ احساں کیوں ہو

برج نرائن چکبست

ولادت ۱۸۸۲ء ——— وفات ۱۹۲۶ء

نام برج نرائن، خاندانی لقب چکبست تھا، تخلص کچھ نہیں رکھا۔

چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے اور ساری عمر یہیں رہے، کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔اے پاس کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا، آپ کا شمار کالج کے ممتاز طلبا میں ہوتا تھا، وکالت لکھنؤ ہی میں شروع کی اور تھوڑے ہی دنوں میں شہرت حاصل کر لی۔ ۲۔ فروری ۱۹۲۶ء کو رائے بریلی میں خطرناک فالج گرا اور انتقال کر گئے۔

بچپن ہی سے شاعری شروع کر دی تھی، اساتذہ کا کلام ہر وقت مطالعہ میں رہتا تھا، انیس اور آتش کو بیحد پسند کرتے تھے، فارسی اور انگریزی ادب کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا، اس لئے چکبست کے یہاں قدیم اور جدید رنگ ایک دوسرے سے ملے ہوئے نظر آتے ہیں، ان کی شاعری، یہاں تک کہ غزلیں بھی حب وطن، قومی بیداری، جذبۂ آزادی اور فرقہ وارانہ اتحاد کے جذبات سے بھری ہوئی ہیں۔

چکبست کا مجموعۂ کلام "صبح وطن" کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ تاثیر، فراوانی جذبات، دلکشی، تازگی کے جوہر بڑی کثرت سے ملتے ہیں، انکی شاعری میں کوئی خاص گہرائی نہیں ہے لیکن ایک مصلح کا جوش ضرور ہے، چکبست کی اکثر نظمیں

مسدس حالی کی شکل میں ہیں، ان کی غزلوں میں بھی عاشقانہ رنگ کے بجائے متین اخلاقی
ملتے اور قومی جذبات کی جھلک ملتی ہے، زبان کی روانی اور بیان کی پاکیزگی کے لحاظ
سے کم شاعر چکبست کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مثنوی گلزار نسیم کے سلسلہ میں شرر سے ان کا
علمی مباحثہ بہت مشہور ہے۔ "صبح اُمید" کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا،
ساری زندگی ادبی فضا میں گزاری۔

نمونۂ کلام

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

وہی قطرہ لہو کا اشک بن کر گر گیا ہوا
جسے ہم نے نمک پروردۂ زخمِ جگر جانا

خود پرستی مٹ گئی قدرِ محبت بڑھ گئی
ماتمِ احباب ہے تعلیم روحانی مجھے

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح
اس کے لئے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب   موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

نہ کوئی دوست دشمن ہو شریکِ درد و غم میرا
سلامت میری گردن پر رہے بارِ الم میرا
لکھا یہ داورِ محشر نے میری فردِ عصیاں پر
یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ
سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چُنے رفاہ کے گُل حُسنِ انتخاب کے ساتھ
شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ
جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

(گوپال کرشن گوکھلے)

اصغر گونڈوی

ولادت ۱۸۸۴ء ——————— وفات ۱۹۳۶ء

سید اصغر حسین نام، اصغر تخلص، اصلی وطن گورکھپور تھا لیکن سکونت گونڈہ میں رہی، ابتدائی تعلیم معمولی تھی لیکن کثرت مطالعہ سے عربی، فارسی اور انگریزی میں اچھی لیاقت پیدا کرلی تھی۔

اصغر، صاحب طرز شاعر تھے، حسن و عشق کے باہمی تعلقات کو حسین اور دلکش پیرائے میں بیان کرتے تھے، ان کی شاعری میں یاس و محرومی کے شکووں کے بجائے شگفتگی، رنگینی، رجائیت، بلند ہمتی اور مفکرانہ گہرائی ہے، تصوف اور فلسفہ کے دقیق مسائل اور رموز کو نئے انداز سے پیش کیا ہے، وہ پیش پا افتادہ مضامین سے گریز کرتے تھے اور بلند خیالات کو نظم کرتے تھے، ان کی شاعری معیاری ہے اور اردو کے ادب عالیہ میں بلند جگہ رکھتی ہے۔

اصغر کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کلام میں ایک خاص یکرنگی اور ہمواری ہے جس کی نظیر شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے یہاں ملے۔

اصغر کے کلام میں "جمالیات" کا ایک مستقل نظریہ ملتا ہے اور وہ اس موضوع کو بڑے دلکش انداز سے نظم کرتے ہیں۔

کلام کے دو مجموعے "نشاط روح" اور "سرود زندگی" شائع ہو چکے ہیں، یہ دونوں مجموعے اگرچہ بہت مختصر ہیں لیکن بلند ترین شاعری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

نمونۂ کلام

رخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

حقیقت کھول دیتا میں جنوں کے رازِ پنہاں کی
قسم دیدی ہو لیکن قیس نے چاکِ گریباں کی

اسیرانِ بلا کی حسرتوں کو آہ کیا کہئے
تڑپ کے ساتھ اونچی ہوگئی دیوار زنداں کی

فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح
لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

رودادِ چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں کے پار ہو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے

یہاں تو عمر گزری ہے اسی موج و تلاطم میں
وہ کوئی اور ہوں گے سیر حاصل دیکھنے والے

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

مے خانۂ ازل میں جہانِ خراب میں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں

میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں
بکھرا دیئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

اس دن بھی میری روح تھی محوِ نشاطِ دید
موسیٰ اُلجھ گئے تھے سوال و جواب میں

جگر مُرادآبادی

ولادت ______________________ سنہ ۱۸۹۰ء

علی سکندر نام، جگر تخلّص اور مرادآباد آبائی وطن ہے، خود جگر صاحب کا مستقل قیام کسی ایک جگہ جم کر کبھی نہیں ہوا۔ ادھر عرصہ سے گونڈہ میں مقیم ہیں

جگر کی تعلیم معمولی ہے لیکن ذوق شاعری ورثہ میں ملا ہے، جگر نے ابتدا میں اپنے والد سے اصلاح لی، بعد میں داغ دہلوی اور پھر امیر اللہ تسلیم کو بھی چند غزلیں دکھائیں ابتدائی دَور کی شاعری میں سادگی، برجستگی، شوخی اور معاملہ بندی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ دوسرے دَور کی شاعری میں انتہائی دلکشی، رنگینی، کیف، سرمستی اور بے خودی پائی جاتی ہے، حقائق و معارف کی بھی چاشنی ملتی ہے۔

جگر ایک رومانی شاعر ہیں، وہ حُسن کے پجاری ہیں اور حُسن کے اداشناس، وہ حُسن و عشق کے معاملات کو نظم کرتے ہیں لیکن کچھ اس طرح کہ مومن، داغ اور حسرت کی راہوں سے نکل کر خود اپنے لئے ایک نئی راہ متعین کرتے ہیں، ان کے کلام میں قنوطیت، بازاریت اور ضرورت سے زیادہ رمزیت نہیں ہے بلکہ ایک خاص قسم کی شوخی ہے اس میں مفکرانہ سنجیدگی کم ہے لیکن جذبات کی شدت نے وہ تیز نشہ عطا کیا ہے کہ اس کا اثر دیر تک زائل نہیں ہوتا۔

جگر کی شاعری پڑھے لکھے عوام کی سمجھ میں آسکتی ہے اس لئے کہ اس میں اُن کے جذبات کی دھڑکن موجود ہے، جگر کی شاعری میں صحیح رنگ تغزل اور ان کی غزلوں میں یہ

ترنم اور حسن کاری ہوتی ہے، جگر ایک پاکیزہ شخصیت، ایک دردمند نگاہ اور ایک حساس دل رکھتے ہیں، ان کی شاعری میں خلوص ہے، یہ خلوص خود ان کی ہی شخصیت اور صداقت کی یکرنگی سے پیدا ہوا ہے، جگر کے خلوص میں ایک والہانہ پن اور سپردگی ہے اور اسی والہانہ پن نے ان کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی لطافت پیدا کر دی ہے۔

نمونۂ کلام

شبِ فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے
کچھ اس میں ان کی توجہ بھی پائی جاتی ہے

بنا بنا کے جو دنیا مٹائی جاتی ہے
ضرور کوئی کمی ہے کہ پائی جاتی ہے

ہمیں پہ عشق کی تہمت لگائی جاتی ہے
مگر یہ شرم جو چہرے پہ چھائی جاتی ہے

گناہگار کے دل سے نہ بچ کے چل زاہد
یہیں کہیں تری جنت بھی پائی جاتی ہے

حسیں تیری آنکھیں حسیں تیرے آنسو
یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے

ارے غضب، ارے ستم وہ اک نگاہ سحر فن
جھکے اگر تو بت کدہ اٹھے اگر تو بت شکن

چھپ کے پہروں اسے او دیکھنے والے یہ بتا
مجھ میں کیا بات نہیں جو مری تصویر میں ہے

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

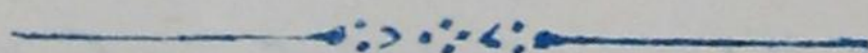
ترکِ طلب اور اطمینان دیکھ تو میرا حُسنِ طلب

یہ حُسن ہے کیا؟ یہ عشق ہے کیا؟ کس کو ہے خبر اس کی لیکن
بے جام ظہور بادہ نہیں، بے بادہ فروغِ جام نہیں

سبھی اندازِ حُسن پیارے ہیں ہم مگر سادگی کے مارے ہیں

لہو آتا نہیں کھینچ کر مژہ تک نہ آئے گی بہار اب کی برس کیا

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا
سرمستیِ ازل مجھے جب یاد آگئی
دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا
زاہد یہ میری شوخیٔ رندانہ دیکھنا
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا



جوش ملیح آبادی

ولادت ـــــــــــــــــــ سنہ ۱۸۹۴ء

نام شبیر حسن خاں، تخلص جوش۔ وطن ملیح آباد ضلع لکھنؤ

موجودہ دور کے سب سے اہم شاعر ہیں۔ ایک دولتمند گھرانے میں پیدا ہوئے بچپن بڑی فارغ البالی سے بسر ہوا، تعلیم رسمی طور پر تو صرف سینیر کیمبرج تک ہوئی لیکن مطالعہ بہت وسیع ہے، ان کے والد، دادا، پردادا سبھی شاعر اور علم دوست تھے گھر پر شاعرے ہوتے رہتے تھے، اسی طرح جوش کو اپنے جوش اور اپنے ذوق کی تربیت اور آبیاری کا موقع بھی ملا۔ شاعری کے ابتدائی زمانہ میں عزیز لکھنوی کے شاگرد ہوئے لیکن جلد ہی اپنے لئے خود راستہ بنانے میں کامیاب ہوئے، والد کے انتقال کے بعد زمینداری کے جھگڑوں اور عزیزوں کی بے اعتنائی سے برگشتہ خاطر ہو کر سنہ ۱۹۲۴ء میں حیدرآباد دکن میں ملازمت اختیار کر لی، وہاں سے سنہ ۱۹۳۴ء میں الگ ہونا پڑا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں دہلی سے "کلیم" کے نام سے ایک رسالہ نکالا اور اپنے کلام کے مختلف مجموعے شائع کرتے رہے۔ پہلا مجموعہ "روح ادب" سنہ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا تھا، اس وقت تک دس گیارہ مجموعے نکل چکے ہیں۔ آزادی ہند کے بعد سے ماہنامہ "آج کل" کے ایڈیٹر رہے، سنہ ۱۹۵۶ء میں پاکستان جا کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔

جوش کی شاعری حساس، جذبات سے بھرے ہوئے خوش فکر اور رنگین مزاج انسان کی شاعری ہے، مناظر فطرت کی مصوری میں انہیں کمال حاصل ہے۔ زندانہ اور

یاسی شاعری کا سلسلہ حیدرآباد میں شروع ہوا اور اس حد تک بڑھا کہ وہ شاعر شباب
ور شاعر انقلاب کہے جانے لگے، جوش کے یہاں ہر جذبہ میں شدت پائی جاتی ہو، چاہے
ہ ملک، قوم اور وطن کے متعلق ہو، چاہے حُسن فطرت کے متعلق، انھیں الفاظ پر غیر معمولی
درت حاصل ہے۔ انداز بیان میں جدت، تشبیہوں اور استعاروں میں ندرت اور زبان
ں بے انتہا روانی پائی جاتی ہے۔

سب سے زیادہ شہرت ان کی عشقیہ، رندانہ اور سیاسی نظموں کو حاصل ہو، ان کی
نقلابی نظموں نے اُردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

نمونۂ کلام

شگوفوں پر بھی آتی ہیں بلائیں یوں تو کہنے کو — مگر جو پھول بن جاتا ہے وہ کھلا ہی جاتا ہے
سمجھتی ہیں مآل گُل مگر کیا زورِ فطرت ہے — سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

ہار میں تو زمیں سے بہار اُبلتی ہے — جو مرد ہے تو خزاں سے بہار پیدا کر
سکرانے کے لئے بے چین ہے صُبح وطن — اور چند سے ظلمت شام غریباں ہے تو کیا؟
دب سے دیکھ چمن میں بہار پھولوں کی — چمک رہی ہیں یہ پیشانیاں رسولوں کی

نوع انساں کو میسر ہی نہیں ہوتا کمال — آہ کس معمار کی یہ حسرتِ تعمیر ہے

دل ہوا اتنا خوشی سے ہم کنار — روح کو احساسِ غم ہونے لگا

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا

لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل میں وہ خطے دوڑ گئے
لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں، ظلمت کا قدم تھرانے لگا

بادل میں چھپا تو کھول دئے، بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا تو گردوں دریا کی طرح لہرانے لگا

سمٹی جو گھٹا تاریکی میں، چاندی کے سفینے دے کے چلا
سنکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا

غرفوں سے جو جھانکا گردوں کے امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے کہسار کا سر چکرانے لگا

پردہ جو اٹھایا بادل کا، دریا پہ تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی، میدان کا دل گھبرانے لگا

ابھرا تو تجلی دوڑ گئی، ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا تو سیاہی دوڑا دی، سلجھا تو ضیا برسانے لگا

کیا کاوش نور و ظلمت ہے، کیا قید ہے کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

فراقؔ گورکھپوری

ولادت ــــــــــــــــــــــــــــ ۱۸۹۶ء

رگھوپتی سہائے نام، فراقؔ تخلص اور گورکھپور وطن ہے، الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں اُستاد ہیں۔

فراقؔ نئے دور کے اُردو شاعروں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، اُن کی شاعری میں مغربی فن و ادب کے اثرات اور ہندی کلچر کی لطافتیں بڑی خوش آہنگی سے سموئی ہوئی ملتی ہیں، انھوں نے اردو غزل کے دامن کو وسیع کرنے کے لئے راہیں نکالیں۔

فراقؔ ایک اعلیٰ معیار کے فن کار شاعر ہیں اور ان کے کلام میں انفرادیت ملتی ہے ان کا حقیقی شاعرانہ کمال غزل کے میدان میں ظاہر ہوتا ہے، جہاں ان کی وجدانی کیفیات اور حُسن و عشق کے واردات بے نقاب ہوتے ہیں اور فکر رسا آسمان کے تارے توڑنے کی کوششیں کرتی ہیں۔

فراقؔ نے اُردو غزل کو جدید ذہن دیا ہے لیکن اُن کے یہاں اُتار چڑھاؤ بہت ہے پست و بلند ان کے یہاں زیادہ ہے، ہمواری کم ہے؛ اگر اس جدید ذہن کو خوشگوار اور ہم آہنگ رچاؤ بھی مل جاتا تو خاصے کی چیز ہوتی۔

نمونۂ کلام

یہ قامت کہ خورشید انگڑائیاں لے ۔۔۔ اُٹھتی جوانی خمستاں خمستاں

وہی اک نظر ڈوبتی جا رہی ہے ۔۔۔ وہی ایک نشتر رگِ جاں رگِ جاں

وہی اک تبسّم چمن در چمن ہے   وہی پنکھڑی ہے گلستاں گلستاں

چلے آ رہے ہیں چلے جا رہے ہیں   کہاں سے کدھر کو خراماں خراماں

یہ غم کے شرارے محبت محبت   یہ جگمگ ستارے حسیناں حسیناں

یہی جذبِ پنہاں کی ہے داد کافی   چلے آؤ مجھ تک گریزاں گریزاں

چھلک کے کم نہ ہو ایسی کوئی شراب نہیں   نگاہِ نرگسِ رعنا ترا جواب نہیں

امیدوار اسی کے تھے میہمانِ بہار   اُڑی تو بوئے چمن کا دماغ بھی نہ ملا

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست   آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بیجا بھی نہیں

یہ تنِ نازنیں کی انگڑائی   کہکشاں نے کمان بھکائی

یہ سوچتا ہوا دنیا سے اُٹھ گیا کوئی   تری نگاہ بھی ہوتی تو کیا ابھی ہوتی

یہی کہتی ہوئی ساغر سے اٹھی موجِ شراب   ہے تہِ جام بھی اک چیز اگر ہوش رہے

تری معصومیاں اے عشقِ رسوا سب بجا لیکن   یہ دنیا ہے فرشتوں پر بھی تہمت آ ہی جاتی ہے

ہجر میں پہلی نگاہ کا ذکر   کب یاد آئی کب کی بات

حفیظ جالندھری

ولادت ــــــــــــــــــ سنہ ۱۹۰۰ء

حفیظ جالندھر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل
کی، کچھ عرصہ تک اسکول میں بھی پڑھا، لیکن اسکول کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر فکر معاش میں
لگ گئے، شعر و شاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا، غزلیں، نظمیں اور گیت لکھتے، اور
احباب کو سناتے، یہی ان کا دلچسپ مشغلہ تھا ـــــ فردوسی کے شاہ نامے کے طرز پر
اردو میں "شاہ نامہ اسلام" لکھنا شروع کیا۔ اس مسلسل نظم میں اسلامی تاریخ بڑے مؤثر
اور دلکش انداز میں نظم کی ہے اس کی اب تک چار جلدیں مکمل ہو چکی ہیں ـــــــ

ـــــ آپ کے کلام میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے اکثر جگہ نقائص نظر آتے ہیں، لیکن بحیثیت
مجموعی قابل تعریف ہے، جوش اور روانی بہت زیادہ ہے، الفاظ سادہ اور آسان
استعمال کرتے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ اسی سادگی نے حفیظ کو مقبول بنا دیا، آپ نے گیت
بھی لکھے ہیں، آسان اور ٹھیٹھ ہندستانی میں، اور خوب لکھے ہیں۔ بعض رومانی نظمیں بھی
بہت اچھی کہیں۔ اب آپ کا رنگ شاعری بہت پختہ ہو گیا ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں بہت اچھا
اور معیاری ہوتا ہے، ان کے پڑھنے کے دلکش انداز میں ایسا جادو ہے جو سننے والوں کو
ہمہ تن گوش بنا دیتا ہے، موجودہ دور میں حفیظ کو بڑی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی، زمانہ جنگ
میں انگریزی حکومت نے ان کو "سانگ پبلیسٹی" کا ڈائرکٹر بنا دیا تھا، "خاں صاحب"
اور "خان بہادر" کے خطابات بھی ہے، یورپ کی سیاحت بھی کی، یہ سب شاعری کی بدولت

اس وقت ہندستان و پاکستان کی ادبی دنیا میں ان کو بڑی مقبولیت و شہرت حاصل ہے
پاکستان کا قومی ترانہ انھیں نے لکھا ہے۔

نمونۂ کلام

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے
رشکِ عدن ہے باغِ وطن بھی
گُل بھی ہیں موجود گُل پیرہن بھی
نازک بدن بھی غنچہ دہن بھی
لیلیٰ روش بھی شیریں سخن بھی
کچھ کم نہیں وہ اُجڑا چمن بھی
اس کے بھی اک بار کرلے نظارے
اپنے وطن میں سب کچھ پیارے

سلام اے آمنہ کے لعل اے محبوبِ سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات فخرِ نوعِ انسانی
سلام اے آتشیں زنجیرِ باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

شاہ نامۂ اسلام

ب رحمۃ للعالمین نے سُن کے فرمایا — کہ میں اس دہر میں قہر و غضب بن کر نہیں آیا

یہ لوگ آج اسلام پر ایماں نہیں لاتے — خدائے پاک کے دامانِ وحدت میں نہیں آتے

لیں ضرور ان کی اسے پہچان جائیں گی — درِ توحید پر اک روز آ کر سر جھکائیں گی

ان کے حق میں کیوں قہرِ الٰہی کی دعا مانگوں — بشر ہیں بے خبر ہیں کیوں تباہی کی دعا مانگوں

یہ فرما کر نبیؐ نے ہاتھ اُٹھا کر اک دعا مانگی
خدا کا فضل مانگا خوئے تسلیم و رضا مانگی

دُعا مانگی "الٰہی! قوم کو چشم بصیرت دے
الٰہی! رحم کر ان پر انہیں نورِ ہدایت دے

جہالت ہی نے رکھا ہے صداقت کے خلاف ان کو
بچارے بے خبر، انجان ہیں کر دے معاف ان کو

فراخی ہمتوں کو، روشنی دے ان کے سینوں کو
کنارے پر لگا دے ڈوبنے والے سفینوں کو

الٰہی فضل کر کہسار طائف کے مکینوں پر
الٰہی! پھول برسا، پتھروں والی زمینوں پر"

آنند نرائن مُلاّ

ولادت ـــــــــــــــــــ ۱۹۰۱ء

آنند نرائن ملاؔ کشمیری برہمنوں کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ان کا گھرانا علم و فضل کے لحاظ سے لکھنؤ میں ممتاز رہا ہے، وہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے ان کے والد پنڈت جگت نرائن ملاؔ یہاں کے مشہور وکیل اور معزز شہری تھے، آنند نرائن ملاؔ نے لکھنؤ ہی میں تعلیم پائی، فارسی اردو گھر پر پڑھی تھی اور شعر و سخن سے لطف اندوز ہونا ابتدائی عمر میں سیکھا تھا۔ ایم۔ اے اور وکالت پاس کرنے کے بعد انھوں نے لکھنؤ ہی میں وکالت شروع کی اور اس پیشہ میں نام پیدا کیا لیکن اس سے زیادہ شہرت انھیں شاعر کی حیثیت سے حاصل ہوئی، ابتدا میں انھیں انگریزی میں شاعری کرنے کا شوق تھا اور فارسی اردو شعراء کے اشعار کا ترجمہ بھی انگریزی میں کرتے رہتے تھے لیکن انکی سلاست طبع اور ذوق شعر کو دیکھ کر بعض بزرگوں نے اردو شاعری کی طرف متوجہ کیا اور انھوں نے ۱۹۲۶ء سے اردو میں کہنا شروع کیا۔ ملاؔ تقریباً ۲۵ برس سے ایک خاص علمی اور ذہنی معیار کی شاعری کر رہے ہیں اور گو وہ بہت نہیں کہتے لیکن پھر بھی ان کے کلام کا اچھا خاصا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا تھا، انھوں نے اپنا کلام "جوئے شیر" کے نام سے شائع کرا دیا ہے۔

ملاؔ غزلیں بھی لکھتے ہیں اور نظمیں بھی، دونوں میں گہرائی، لطافت، تازگی اور فنی خوبیاں پائی جاتی ہیں، وہ بالعموم اپنے ذاتی تجربات اور محسوسات ہی کو نظم کرتے ہیں اور محض خیال پر اپنی شاعری کی بنیاد نہیں رکھتے۔ واقعات زمانہ اور حالات کو وہ اپنی

عری میں لطافت کے ساتھ پیش کرتے ہیں، وطنیت اور قومیت کا جذبہ، انسان
تی اور محبت کا جذبہ شدت کے ساتھ ان کی شاعری میں نمایاں ہوتا ہے، ان کی زبان
ت سلیس اور رواں ہو، اور انداز بیان میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔

نمونۂ کلام

ر کو مشعلِ ایماں سے آگہی نہ ملی | دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی
ھ کے آخر شب شمع ہوگئی خاموش | کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی

سینہ کی حرارت سے خالی گرمیِ چراغِ شام نہ لے
یہ دل ہے امانت دنیا کی اپنا ہی بس اس سے کام نہ لے

مے سب کو نہ ہو تقسیم اگر اپنا بھی الٹ دے پیمانہ
یہ کفر ہے کیش رندی میں ساقی سے اکیلے جام نہ لے

پی پینے والے انداز سے پی یہ زہر بھی ہو اور امرت بھی
کیف ایام کے دھوکے میں دیوانگی ایام نہ لے

اس مے کو نہ پی قطرہ قطرہ، گن گن کے نہ لے سانسیں اپنی
جینا ہے تو جی جینے کی طرح جینے کا فقط الزام نہ لے

بس تو یہ بھی نہیں اک پھول قفس میں رکھ لیں
اور نگاہوں میں گلستاں کا گلستاں ہونا

ترا لطف آتشِ شوق کو حد زندگی سے بڑھا نہ دے
کہیں بجھ نہ جائے چراغ ہی اسے دیکھ اتنی ہوا نہ دے

ترے دل پہ حق ہے جہان کا یہ فرارِ عشق روا نہیں
غمِ دوست خوب ہو جب تلک غمِ زندگی کو بُھلا نہ دے

یہ خزاں بدوش سموم تو ہے گلوں کے ظرف کا امتحاں
وہی گُل ہے گُل جو فسردہ ہو تو فسردگی بھی بہار دے

کسی آسماں پہ ارم لئے کوئی منتظر ہے تو مجھ کو کیا
وہ مرا خدا ہے جو خلد کو اسی خاکداں پہ اُتار دے

نہ جانے کتنی شمعیں گُل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

بس ایک پھول نمایاں ہے دل کے داغوں میں
یہاں بہار کی تھی تری چشم التفات کبھی

اختر شیرانی

ولادت ۱۹۰۵ء —————— وفات ۱۹۵۰ء

نام اختر خاں ۔ تخلص اختر ۔ باپ کا نام حافظ محمود خاں شیرانی، جو مشہور عالم
ور محقق گزرے ہیں
ریاست ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے، لاہور میں تعلیم و تربیت ہوئی، اورنٹیل
الج سے منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کئے۔
اختر شعر و شاعری سے فطری لگاؤ رکھتے تھے۔ بچپن ہی سے مشق سخن شروع کر دی
پہلے صابر علی خاں شاکر سے اصلاح لی، پھر اپنے ذوق کی رہنمائی پر اعتماد کیا۔
اختر بہت شوخ و رنگین مزاج انسان تھے، مناظر قدرت کے دلدادہ تھے،
وہ جذباتی شاعر تھے اور جذبات میں عشق و محبت کی شدت ہے۔ اردو میں ہندی اور سنسکرت
کے الفاظ بہت مناسب طریقہ پر استعمال کرتے تھے، ان کے کلام کے متعدد مجموعے شائع
ہو چکے ہیں، غزلوں سے زیادہ نظمیں مقبول ہیں جن میں رومانیت کے جلوے نظر آتے ہیں
غزلوں اور نظموں کے علاوہ اختر کے یہاں گیتوں کا بھی ایک کافی حصہ موجود ہے، انھیں زبان
کی تراش خراش اور نت نئی صنعت گری کا بھی شوق تھا۔ مناظر قدرت کی عکاسی اور جذبات
انسانی کی تصویر کشی میں کمال حاصل تھا، ان کے کلام میں خیال کی لطافت اور لفظوں کے ترنم
نے ایک خاص دلآویز حسن پیدا کر دیا ہے۔

نمونۂ کلام

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو   کہ جو شے ہے نگاہوں کو حسیں معلوم ہوتی ہے

خوابِ نوشیں میں ہے وہ جانِ بہار   نور و نکہت کی داستانِ خموش

سرورآباد ہستی میں میں اک سازِ شکستہ ہوں
مرے خاموش تاروں کو ترنّم آشنا کر دے

پلائے جا پئے جا خوب ساقی   کہ ہستی ہے سراسر اتفاقی
چھلک جائے نہ مینائے دو عالم   ہمارا ہاتھ ہے اور زلفِ ساقی

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے لعنت گہِ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے، اس نفس پرستی سے
دُور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

سردیوں کی چاندنی، شبنم سے کھلاتی تھی جب
باغ پر اک دُھندلی دُھندلی مستی چھاجاتی تھی جب
آہ وہ راتیں! وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے

اعتبارات یہ قائم ہے نظامِ ہستی
یہ زمیں کچھ بھی نہیں، دورِ زماں کچھ بھی نہیں

well

احسان دانش

ولادت ــــــــــــــــــــ سنہ ۱۴ ۱۹ء

نام احسان الحق، تخلص احسان، والد کا نام قاضی دانش علی۔ قصبہ
کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے، غربت و افلاس کے باعث تعلیم سے محروم رہے
محنت مزدوری کرتے رہے، یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا، پھر مزدور سے تاجر بنے
اور اس کے بعد شاعر، انھوں نے اپنی دنیا آپ پیدا کی، ان کی شہرت بہت ہوئی عوام
میں زیادہ مقبول ہوئے، ان کو صحیح معنوں میں انقلابی شاعر کہا جا سکتا ہے، ان کے خیال
میں شاعری کا معاشرتی پہلو اہم تر ہے اور زندگی کے جذبات و واقعات کو عام فہم
زبان میں بڑے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔

احسان انقلابی شاعر ہیں۔ منظر نگاری اور جذبات انسانی کی تصویر کشی میں ان کو
کمال حاصل ہے، تشبیہہ و استعارے اچھوتے اور دلکش ہوتے ہیں، نظم میں اقبال سے
فیض حاصل کیا ہے، وہ عوام کے محبوب شاعر ہیں، لاہور میں قیام ہے۔

نمونۂ کلام

یہی دہقاں چلاتے ہیں جو ہل بنجر زمینوں میں
چراغ آرزو سے دل ہیں روشن ان کے سینوں میں

یہ وہ انسان ہیں دامانِ مشقت میں جو پلتے ہیں
جہاں سوتا ہے اور یہ آبیاری کو نکلتے ہیں

ابھی ہوتا نہیں کچھ ذکر ہُو حق پارساؤں میں
جُدا بچّوں سے ہو جاتے ہیں یہ تاروں کی چھاؤں میں

انھیں فاقوں سے گھبرائے ہوؤں میں پارسائی ہے
انھیں ڈوبے ہوؤں کے دم سے زندہ ناخدائی ہے

مئی کے مہینے کا جلّاد سورج۔ برنگِ تپش آگ برسا رہا ہے
تڑپتے ہیں ذرّات کرنوں کی زد پر، بیاباں پہ ابرِ جنوں چھا رہا ہے

ہواؤں کے جھونکوں کے ہمراہ گویا درختوں کی سبزی اُڑی جا رہی ہے
نکلتی ہے آنچ اس طرح کھیتیوں سے، کناروں کا سبزہ جلا جا رہا ہے

ہوئیں سُرخ تپ تپ کے کانٹوں کی نوکیں مُڑی جا رہی ہیں درختوں کی شاخیں
ہیں پکسے ہوئے برگ، جُھلسے ہوئے گُل، بُرا جانکنی کا سماں چھا رہا ہے

فلک دہکا دہکا، فضا پگھلی پگھلی، ہوا تپتی تپتی، زمیں تانبا تانبا
ہے اُبلی ہوئی آبگیروں میں کائی، کوئی جیسے پانی کو کھولا رہا ہے

دلوں میں ہے روحِ جہنّم کی حدّت، نگاہوں میں آتش کدوں کی حرارت
پسینہ ہے ماتھوں پہ یا رفتہ رفتہ، دماغوں کا جوہر بہا جا رہا ہے

مجاز

ولادت ۱۹۱۱ء ـــــــــــ وفات ۱۹۵۵ء

نام اسرار الحق، تخلص مجاز، باپ کا نام سراج الحق۔ دورِ جدید کے اُردو شعراء میں مجاز نہ صرف ہر دلعزیز شاعر تھے بلکہ اہمیت بھی رکھتے تھے۔ ان کا وطن رُدولی ضلع بارہ بنکی تھا۔ بی۔ اے کا امتحان علی گڈھ یونی ورسٹی سے پاس کیا طالب علمی ہی کے زمانہ سے شاعری میں شہرت حاصل کر چکے تھے اور انداز بیان میں ایک لطافت، خیالات میں تازگی اور بغاوت لے کر میدان شاعری میں اُترے تھے۔ ابتدائی شاعری پر جوش ملیح آبادی کا اثر تھا، لیکن ان کی ذہانت اور شاعرانہ صلاحیت نے اپنا راستہ خود بنا لیا تھا۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مجاز آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم ہو گئے، محکمہ ریڈیو نے اپنا جو رسالہ "آواز" نکالا تھا، مجاز اس کے پہلے اڈیٹر تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندستان میں سیاسی تحریک جمہوریت اور آزادی کی طرف بڑھ رہی تھی اور نوجوان غیر آسودہ ہو کر حکومت سے اپنا تعلق قطع کر رہے تھے، مجاز نے بھی سرکاری نوکری چھوڑ دی۔ تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا، اس درمیان میں وہ ایک نئے انقلابی شاعر کی حیثیت سے بہت مقبول ہو چکے تھے، ۱۹۳۶ء میں وہ مستقلاً لکھنؤ چلے گئے، یہاں چند ساتھیوں کے ساتھ "نیا ادب" اور "پرچم" نکالا۔ اس عرصہ میں تھوڑی بہت نثر بھی لکھتے رہے۔

۱۹۳۹ء میں مجاز کی نظموں کا مجموعہ ''آہنگ'' شائع ہوا یہ اُردو شاعری
میں ایک نئی آواز تھی، اس کی بعض نظمیں نئے شاعروں کے لئے مشعلِ راہ
بن گئیں۔ ان نظموں میں بیک وقت رنگینی، لطافت، انقلابی جوش، شعریت اور پختگی
ملتی ہے۔ مجاز کی زبان آسان مگر شاندار ہے۔ تشبیہ استعارے مناسب اور نئے ہیں
ان کی صحت خراب رہتی تھی، اسی لئے کم لکھتے تھے، اس وقت ان کا جو مجموعہ ''سازِ نو''
کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں تقریباً ان کی ساری نظمیں اور غزلیں شامل ہیں،
وہ مشہور ترقی پسند ادب تحریک سے وابستہ تھے۔

مجاز کے کلام میں حُسن و عشق سے بھرپور لُطف اندوزی اور سرشاری کے جذبات
نظر آتے ہیں، اس کی نظر بلند اور فکر رسا ہے، وہ زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں
سے شکست خوردہ جذبات نہیں رکھتا ہے بلکہ اسکے حوصلے بلند ہیں اور انداز فاتحانہ۔

مجاز ایک ترقی پسند شاعر ہونے کے باوجود تبلیغ اور پروپگنڈے سے مرعوب
نہیں ہوا۔ بلکہ جو کہا وہ اپنی طبیعت کی سرشاری اور دلی کیفیات سے متاثر ہو کر کہا۔ اسی لئے
اس کے کلام میں تاثیر کا وہ اہم جز ہر موجود ہے جو شاعری کی شرط اولین ہے، مجاز کو غزل
اور نظم پر یکساں عبور تھا، جذبہ کی سرشاری اور زبان کی چاشنی نے مجاز کی غزلوں کو خاصے
کی چیز بنا دیا ہو اور اسکی نظموں میں ہمت، مردانگی کا ایک خوشگوار آہنگ ہے۔

نمونۂ کلام

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیٔ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سُن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیٔ وحشت کی قسم حیرت کی قسم حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسّم پا بھی گئے

آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم   میری میخواری ابھی تک راز ہے

یری وارفتگیٔ شوق مسلّم لیکن   کس کی آنکھیں ہیں زلیخا کا حسیں خواب لیے

للہ اللہ وہ پیشانیِ سیمیں کا جمال   رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات

ہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
گمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
یر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہنازِ لالہ رُخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

(آوارہ)

———•:>•:•<:•———

فیض

ولادت

فیض احمد نام، فیض تخلص اور لاہور وطن ہے۔ فیض ایک ممتاز ترقی پسند شاعر
یں جن کے کلام میں فکر و جذبہ کی ہم آہنگی نے ایک لطیف حُسن اور دلکشی پیدا کر دی ہے
ور شدت تاثیر کا عنصر غالب ہے۔ فیض ایک بڑے فنکار ہیں اور ان کی تخلیقات میں فنکارانہ
ال ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے زبردست علمبردار ہیں اور ان کی فکر و
فتار کا ایک ایسا بلند انفرادی انداز ہے جس کی وجہ سے وہ دوسرے ترقی پسند شعراء
سے ممتاز نظر آتے ہیں، ان کے یہاں فلسفیانہ خیالات کی بھی جھلک نظر آتی ہے،
جس سے اُن کے کلام میں گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔

نمونۂ کلام

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی

نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

ن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک

سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں

جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب   آج تم بے حساب یاد آئے

غمِ جہاں ہو، غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم

جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

صبحِ گُل ہو کہ شامِ مے خانہ   مدح اُس رُوئے نازنیں کی ہے

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے

کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے

ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

فہرست اسماء شعراء مع تواریخ ولادت و وفات

نمبر شمار	نام شاعر	سال ولادت	مقام ولادت	سال وفات	مقام وفات	عمر
۱	امیر خسرو دہلوی	۱۲۵۳ء	پٹیالی ضلع ایٹہ	۱۳۲۴ء	دہلی	۷۱ سال
۲	ولی دکنی	۱۶۶۸ء	اورنگ آباد دکن	۱۷۴۴ء	احمد آباد	۷۴ ؍؍
۳	مرزا رفیع سودا	۱۷۱۳ء	دہلی	۱۷۸۰ء	لکھنؤ	۶۷ ؍؍
۴	خواجہ میر درد	۱۷۲۰ء	دہلی	۱۷۸۴ء	دہلی	۶۴ ؍؍
۵	میر تقی میر	۱۷۲۶ء	آگرہ	۱۸۱۰ء	لکھنؤ	۸۸ ؍؍
۶	میر حسن	۱۷۲۷ء	دہلی	۱۷۸۶ء	لکھنؤ	۵۹ ؍؍
۷	نظیر اکبر آبادی	۱۷۳۵ء	دہلی	۱۸۳۰ء	آگرہ	۹۵ ؍؍
۸	مصحفی	۱۷۵۰ء	امروہہ (مراد آباد)	۱۸۲۴ء	لکھنؤ	۷۴ ؍؍
۹	انشاء	۱۷۵۶ء	مرشد آباد	۱۸۱۷ء	لکھنؤ	۶۱ ؍؍
۱۰	بہادر شاہ ظفر	۱۷۷۵ء	دہلی	۱۸۶۳ء	رنگون	۸۸ ؍؍
۱۱	آتش	۱۷۷۷ء	فیض آباد	۱۸۴۶ء	لکھنؤ	۶۸ ؍؍
۱۲	ناسخ	۱۷۸۷ء	فیض آباد	۱۸۳۸ء	لکھنؤ	۵۱ ؍؍
۱۳	ذوق	۱۷۸۹ء	دہلی	۱۸۵۴ء	دہلی	۶۵ ؍؍
۱۴	مرزا غالب	۱۷۹۶ء	آگرہ	۱۸۶۹ء	دہلی	۷۳ ؍؍
۱۵	مومن	۱۸۰۰ء	دہلی	۱۸۵۱ء	دہلی	۵۱ ؍؍
۱۶	میر انیس	۱۸۰۱ء	فیض آباد	۱۸۷۴ء	لکھنؤ	۷۳ ؍؍
۱۷	مرزا دبیر	۱۸۰۳ء	دہلی	۱۸۷۵ء	لکھنؤ	۷۲ ؍؍
۱۸	نسیم لکھنوی	۱۸۱۱ء	لکھنؤ	۱۸۴۳ء	لکھنؤ	۳۲ ؍؍
۱۹	محسن کاکوروی	۱۸۲۷ء	کاکوری	۱۹۰۵ء	مین پوری	۷۸ ؍؍
۲۰	اختر (واجد علی شاہ)	۱۸۲۷ء	لکھنؤ	۱۸۸۸ء	کلکتہ	۶۱ ؍؍
۲۱	امیر مینائی	۱۸۲۸ء	لکھنؤ	۱۹۰۰ء	حیدر آباد	۷۲ ؍؍
۲۲	داغ دہلوی	۱۸۳۱ء	دہلی	۱۹۰۵ء	حیدر آباد	۷۴ ؍؍
۲۳	محمد حسین آزاد	۱۸۳۲ء	دہلی	۱۹۱۰ء	دہلی	۷۸ ؍؍
۲۴	حالی	۱۸۳۷ء	پانی پت	۱۹۱۴ء	پانی پت	۷۷ ؍؍
۲۵	اکبر الہ آبادی	۱۸۴۶ء	بارہ ضلع الہ آباد	۱۹۲۱ء	الہ آباد	۷۵ ؍؍

نمبر شمار	نام شاعر	سال ولادت	مقام ولادت	سال وفات	مقام وفات	عمر
۲۶	شاد عظیم آبادی	۱۸۴۶ء	پٹنہ	۱۹۲۷ء	پٹنہ	۸۱ سال
۲۷	شوق قدوائی	۱۸۵۳ء	جگور (لکھنؤ)	۱۹۲۵ء	لکھنؤ	〃
۲۸	نظم طبا طبائی	۱۸۵۳ء	لکھنؤ	۱۹۲۸ء	حیدرآباد	〃
۲۹	ریاض خیرآبادی	۱۸۵۴ء	خیرآباد (اودھ)	۱۹۳۴ء	گورکھپور	۸۸ 〃
۳۰	صفی لکھنوی	۱۸۶۲ء	لکھنؤ	۱۹۵۰ء	لکھنؤ	۸۸ 〃
۳۱	آرزو لکھنوی	۱۸۷۲ء	〃	۱۹۵۰ء	لکھنؤ	〃
۳۲	سرور جہان آبادی	۱۸۷۴ء	جہان آباد ضلع پیلی بھیت	۱۹۱۰ء	جہان آباد	۳۸ 〃
۳۳	ڈاکٹر اقبال	۱۸۷۵ء	سیالکوٹ	۱۹۳۸ء	لاہور	۶۳ 〃
۳۴	حسرت موہانی	۱۸۷۸ء	اُناؤ	۱۹۵۱ء	لکھنؤ	۷۳ 〃
۳۵	مولانا محمد علی جوہر	۱۸۷۸ء	رام پور	۱۹۳۱ء	لندن	۵۳ 〃
۳۶	فانی بدایونی	۱۸۷۹ء	بدایوں	۱۹۴۱ء	حیدرآباد	۶۲ 〃
۳۷	سیماب اکبرآبادی	۱۸۸۰ء	اکبرآباد	۱۹۵۱ء	کراچی	۷۱ 〃
۳۸	عزیز لکھنوی	۱۸۸۲ء	لکھنؤ	۱۹۳۵ء	لکھنؤ	۵۳ 〃
۳۹	چکبست	۱۸۸۲ء	فیض آباد	۱۹۲۶ء	رائے بریلی	۴۴ 〃
۴۰	اصغر گونڈوی	۱۸۸۴ء	گونڈہ	۱۹۳۶ء	الہ آباد	۵۲ 〃
۴۱	جگر مرادآبادی	۱۸۹۰ء	مرادآباد	تم سلامت رہو ہزار برس		
۴۲	جوش ملیح آبادی	۱۸۹۴ء	ملیح آباد	〃	〃	〃
۴۳	فراق گورکھپوری	۱۸۹۶	گورکھپور	〃	〃	〃
۴۴	حفیظ جالندھری	۱۹۰۰ء	جالندھر	〃	〃	〃
۴۵	آنند نرائن ملا	۱۹۰۱ء	لکھنؤ	〃	〃	〃
۴۶	اختر شیرانی	۱۹۰۵ء		۱۹۵۰ء	لاہور	〃
۴۷	احسان دانش	۱۹۱۴ء	کاندھلہ ضلع مظفر نگر	تم سلامت رہو ہزار برس		
۴۸	مجاز	۱۹۱۱ء	لکھنؤ	۱۹۵۵ء	لکھنؤ	
۴۹	فیض			تم سلامت رہو ہزار برس		

ماخذ

اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔



نام کتاب	مصنف	نام مطبع
آب حیات	محمد حسین آزاد	شیخ مبارک علی لاہور
تذکرہ گلشن بے خار	مصطفٰے خاں شیفتہ	نولکشور پریس لکھنؤ
سخن شعراء	عبدالغفور نساخ	" " "
یادگار غالب	مولانا حالی	شیخ مبارک علی لاہور
کلیات محسن	محسن کاکوروی	انوار المطابع لکھنؤ
روح انیس	مسعود حسن رضوی	کتاب نگر لکھنؤ
کلیات مراثی انیس	میر انیس لکھنوی	نولکشور بکڈپو لکھنؤ
کلیات مراثی مرزا دبیر	مرزا دبیر لکھنوی	" " "
کلیات نظیر	نظیر اکبر آبادی مرتبہ عبدالباری آسی	" " "
کلیات میر تقی میر	مرتبہ مولانا آسی	" " "
کلیات ظفر	بہادر شاہ ظفر دہلوی	" " "
کلیات مومن	حکیم مومن خاں دہلوی	" " "

نام کتاب	مصنف	نام مطبع
کلیات آتش	خواجہ حیدر علی آتش	نولکشور بکڈپو لکھنؤ
کلیات سودا	مرزا رفیع سودا مرتبہ مولانا آسی	״ ״ ״
دیوان میر درد	خواجہ میر درد دہلوی	״ ״ ״
دیوان ذوق	مرتبہ محمد حسین آزاد مع حالات	مفید عام لاہور
میر تقی میر حیات اور شاعری	خواجہ احمد فاروقی	انجمن ترقی اردو علی گڈھ
صنم خانہ عشق	امیر مینائی	نولکشور پریس لکھنؤ
تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر رام بابو سکسینہ	״ ״ ״
شعر الہند	عبد السلام ندوی	دار المصنفین اعظم گڈھ
گل رعنا	مولانا عبد الحی ندوی	״ ״
اردو شاعروں کا البم	زیدی دہلوی	غالب بکڈپو لاہور

ان کتابوں کے علاوہ دور حاضر کے تمام بلند پایہ شاعروں کا مطبوعہ کلام پیش نظر رہا۔

نورانی

صفحہ	۵۵	سطر	۲	غلط	نظر نہیں آتا	صحیح	نہیں ہوتا
〃	۶۰	〃	۳	〃	شب	〃	سب
〃	۶۱	〃	۱۰	〃	کو	〃	میں
〃	۶۱	〃	۱۲	〃	ہے	〃	ہیں
〃	۶۵	〃	۵	〃	کہاں	〃	واں
〃	۶۵	〃	۱۱	〃	عرفاں ہیں	〃	عُرفاں ہیں
〃	۶۷	〃	۱۱	〃	یاد	〃	یا
〃	۶۸	〃	۳	〃	سنہ ۱۸۲۸ء کو	〃	سنہ ۱۸۲۸ء میں
〃	۷۵	〃	۲	〃	شروع ہوئی	〃	شروع ہوئیں
〃	۷۹	〃	۴	〃	سوگ یاں کا	〃	سوگ ہی یہاں کا
〃	۸۶	〃	۳	〃	ضلع بارہ بنکی	〃	ضلع لکھنؤ
〃	۸۸	〃	۲	〃	وفات سنہ ۱۹۳۳ء	〃	وفات سنہ ۱۹۲۸ء
〃	۸۸	〃	۶	〃	سنہ ۱۸۸۷ء	〃	سنہ ۱۸۸۸ء
〃	۹۳	〃	۱	〃	صحیح تشریح	〃	تصحیح وتشریح
〃	۹۴	〃	۲	〃	سنہ ۱۸۷۳ء	〃	سنہ ۱۸۷۲ء
〃	۹۵	〃	۸	〃	غمزہ	〃	غمزدہ
〃	۹۶	〃	۲	〃	سنہ ۱۸۷۳ء	〃	سنہ ۱۸۷۴ء
〃	۱۰۰	〃	۱۱	〃	شیشۂ	〃	شیشہ
〃	۱۰۰	〃	۱۲	〃	تاروں کے	〃	تاروں سے
〃	۱۰۳	〃	۲	〃	ولادت سنہ ۱۸۷۵ء	〃	ولادت سنہ ۱۸۷۸ء
〃	۱۰۵	〃	۶	〃	مرا	〃	مراد
〃	۱۱۸	〃	۹	〃	حاصل	〃	ساحل
〃	۱۲۵	〃	۱۱	〃	ہیں	〃	ہے
〃	۱۲۷	〃	۱۷	〃	سے	〃	ملے
〃	۱۲۸	〃	۱۱	〃	سب کچھ پیارے	〃	سب کچھ ہے پیارے

ایک التما[illegible]

قارئین سے التماس ہے کہ کتاب [illegible] ط کو درست کرلیں جو باوجود احتیاط کے باقی ہیں۔

صفحہ ۴ — مجاز کے بالمقابل آخری کالم پر نمبر ۱۳۷

صفحہ ۴ — نمبر ۹۴ کے بعد مجاز کے نیچے فیض آخری کالم پر نمبر ۱۴۱

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸	۸	۱۳۱۴ء	۱۳۲۴ء
۹	۱۱	جو	جو
۹	۱۵	ہتھیاں	رتھیاں
۱۰	۱۰	کالا کالا	کالا
۱۱	۱۴	باقاعد	باقاعدہ
۱۵	۱۴	بد	بند
۱۵	۱۸	کہ	کہہ
۱۸	۴	معرف	معرفت
۱۸	۱۳	حافظ شیرازی لی	حافظ شیرازی کی
۲۱	۳	احتلاف	اختلاف
۲۲	۸	آخر	آخری
۲۷	۹	اس کا کاکل	اس کاکل
۳۲	۱۱	یا	باں
۴۲	۱۷	آتشیں	آستیں
۴۴	۴	شاعری کرنا	شاعری
۴۵	۱۱	صفائی اور	صفائی سے اور
۴۵	۱۴	ظاہرا	ظاہری
۴۷	۲	۱۷۹۶ء	۱۷۶۶ء
۵۰	۱	آرائش کاکل	آرائش خم کاکل

